اشتیاق احمد

انسپکٹر جمشید سیریز نمبر ۱۰

پُراسرار اور چونکا دینے والے واقعات پر مبنی

اشتیاق احمد

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس، ۱۰۔ ہسپتال روڈ، لاہور
قیمت : چار روپے ۵۰ پیسے

مقام اشاعت
شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ پبلشرز
ادبی مارکیٹ چوک انار کلی، لاہور

پھول سے پیارے بچو،

پچھلے ناول کے بارے میں بہت سے بچوں کے خطوط پڑھ چکا ہوں۔ کچھ ابھی باقی ہیں۔ اس وقت تک جتنے خطوط پڑھے ہیں، اکثر میں "پُراسرار بوڑھا" کی پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے ــ چند خطوں میں لکھا گیا ہے کہ "پُراسرار بوڑھا" پسند نہیں آیا! بہرحال یہ تو ہوتا ہی ہے۔ ایک کہانی کچھ لوگوں کو پسند آتی ہے، کچھ کو ناپسند ــ لیکن اگر اکثریت کو پسند آجائے تو پھر اسے کامیاب کہانی ہی کہا جائے گا ــ

"پُراسرار بوڑھا" جن بچوں کو پسند نہیں آیا، "عمارت میں بم" انہیں بھی پسند آئے گا ــ کہانی ہی ایسی جوڑ توڑ والی ہے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کو کام کرنے کا موقع ذرا کم ہی ملا ہے، لیکن جہاں بھی آئے ہیں، خوب آئے ہیں ــ آخر میں فرزانہ تو بازی ہی لے جاتی ہے ــ اس مرتبہ ناول کے بارے میں جو سوال کیا جا رہا ہے، بہت آسان ہے۔ امید ہے آپ ذہن پر ذرا سا زور دے کر ہی جواب معلوم کر لیں گے ــ آئندہ ناول "گڑیوں کی وبا" پیش کیا جا رہا ہے۔

اشتیاق احمد

ترتیب :

بم رکھ دیا

انسپکٹر جمشید شام کی چائے کے بعد سے ہی کہیں جانے کی تیاری میں مصروف تھے - آج انھوں نے اپنا بہترین سوٹ نکالا تھا - اس پر ٹائی بھی لگائی تھی جب کہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ ٹائی سے پرہیز کرتے تھے - سر پر اپنا خاص ہیٹ پہنا تھا - اس کے بعد بھی کچھ ضروری کاموں میں مگن تھے - ان کی تیاری ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی -

محمود، فاروق اور فرزانہ ان کی یہ تیاریاں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے - ان کے والد تو بہت سادہ مزاج تھے اور کہیں جانے کے سلسلے میں اتنی لمبی چوڑی تیاری کبھی نہیں کرتے تھے — آخر فرزانہ سے رہا نہ گیا، پوچھ ہی بیٹھی :

" ابا جان، آخر آج آپ کو کہاں جانا ہے ؟"

" بیٹی، یہ بات میں نہیں بتا سکتا "

" جی کیا مطلب ؟" فرزانہ چونکی -

" مطلب یہ کہ آج مجھے ایک ایسی جگہ جانا ہے جس کے بارے میں میں کسی کو نہیں بتا سکتا -"

" ہمیں بھی نہیں ؟"

محمود نے حیران ہو کر پوچھا -

" نہیں، کسی کو بھی نہیں — تمہاری امی کو بھی نہیں -" انھوں نے

مسکرا کر کہا۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں، ہم کسی کو بتا دیں گے؟" محمود بولا۔

"نہیں ۔۔۔ لیکن تم سے کوئی زبردستی تو معلوم کر سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا آپ ہمیں اتنا ہی کمزور سمجھتے ہیں؟" فاروق نے بُرا مان کر کہا۔

"نہیں ۔۔۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ میں کسی کو بھی نہ بتاؤں۔" انہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اچھا، جیسے آپ کی مرضی ۔۔۔ ویسے ہم پتا چلا ہی لیں گے کہ آپ آج کہاں جانے والے ہیں۔" فاروق بولا۔

"اگر تم نے پتا چلا لیا تو میں تمہیں سو روپے انعام دوں گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"ابا جان، یہ سو روپے والی بات غلط ہے۔" فرزانہ نے چہک کر کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"سو روپے ہم برابر برابر کیسے تقسیم کریں گے ۔۔۔ آپ ڈیڑھ سو روپے انعام نہیں دے سکتے۔"

فرزانہ نے معصومانہ لہجے میں کہا اور سب مسکرا اٹھے۔

"چلو یونہی سہی ۔۔۔ اگر تم نے مجھے صبح تک یہ بتا دیا کہ میں کہاں گیا تھا تو میں تمہیں ڈیڑھ سو روپے انعام دوں گا۔"

"آ گیا مزا ۔۔۔ ہم ضرور معلوم کر کے رہیں گے۔"

فرزانہ نے اچھل کر کہا۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز میں

مسکرائے جا رہے تھے۔

"ابا جان، آپ کی مسکراہٹ بہت عجیب ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم یہ بات معلوم نہیں کر سکیں گے؟" فاروق نے پوچھا۔

"نہیں تو ۔۔۔ اس بات کا امکان ہے کہ تم معلوم کر لو گے۔" وہ برابر مسکرائے جا رہے تھے۔

"تو پھر آپ اس طرح کیوں مسکرا رہے ہیں؟" فاروق نے پھر کہا۔

"اس کی وجہ اور ہے۔" انہوں نے جواب میں کہا۔

"اوہ، میں سمجھ گیا۔" محمود چونک کر بولا۔

"کیا سمجھ گئے؟" بیگم جمشید نے اس گفتگو میں پہلی مرتبہ دخل دیا۔

"یہی کہ ابا جان نے ڈیڑھ سو روپے کا انعام رکھ کر اپنے آپ کو صاف بچا لیا ہے۔"

"صاف بچا لیا، کیا مطلب؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، اب ہم ابا جان سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ کہاں جا رہے ہیں ۔۔۔ اب یہ بات ہمیں خود معلوم کرنا ہے۔ دوسری صورت میں ہم ان کے پیچھے پڑ جاتے اور شاید مجبور ہو کر انہیں بتانا پڑتا۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا ۔۔۔ انہوں نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔ ان کے سر ہلانے کے انداز سے پتا چل گیا کہ محمود کا خیال ٹھیک تھا ۔۔۔ ان کے مسکرانے کی وجہ یہی تھی۔

"اچھا بچو، سات بج رہے ہیں۔ اب مجھے روانہ ہو جانا چاہیے اور تمہیں یہ

معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دینی چاہیے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے اپنی جیب میں پستول رکھتے ہوئے کہا۔

"پستول ساتھ لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی مہم پر جا رہے ہیں۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے ابا جان۔" محمود نے پوچھا۔

"دیکھو بھئی، مجھے ڈیڑھ سو روپے دینے ہیں۔۔۔ اس لیے میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔۔۔ ہمیں خود بھی آپ سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہیے۔" محمود نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"اچھا خدا حافظ۔" انہوں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"خدا حافظ۔" چاروں نے ایک ساتھ کہا۔

ان کے جانے کے بعد فرزانہ نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بیگم جمشید گھریلو کاموں میں مصروف ہو گئیں۔۔۔ وہ تینوں پائیں باغ والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے، ابا جان کہاں گئے ہیں۔" محمود نے پہل کی۔

"اس کے لیے ذہن پر زور دینا پڑے گا۔" فرزانہ بولی۔

"زور کس چیز سے دیا جاتا ہے۔" فاروق نے پوچھا۔

"اگر تم نے مذاق شروع کرنے کی کوشش کی تو ہم ڈیڑھ سو روپے سے محروم ہو جائیں گے۔" محمود نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ابا جان نے یہ کب کہا تھا کہ اگر میں نے مذاق کیا تو انعام نہیں دیا جائے گا۔" فاروق نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"انہوں نے تو نہیں کہا تھا لیکن مذاق میں جو وقت خرچ ہو گا، وہی ہم سوچنے میں خرچ کر سکتے ہیں۔"

"تم تو خرچ کرنے پر تل گئی ہو۔۔۔ فضول خرچی بری بات ہے۔" فاروق جھٹ سے بولا۔

"دماغ خرچ کرنے سے کوئی کمی نہیں پڑتی۔" فرزانہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم دونوں پر خرچ کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔" محمود نے تنگ آ کر کہا۔

"ایک بات ثابت ہو گئی۔" فرزانہ نے گویا اعلان کیا۔

"وہ کیا؟"

محمود نے جلدی سے پوچھا۔۔۔ وہ سمجھا، شاید فرزانہ کو ان کے والد کے جانے کی جگہ کے بارے میں کچھ اندازہ ہو گیا ہے۔

"وہ یہ کہ جہاں فاروق موجود ہو، وہاں سنجیدگی نہیں ہو سکتی اور جہاں سنجیدگی موجود ہو، وہاں فاروق نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔"

"دھت تیرے کی۔۔۔ میں سمجھا، شاید تمہیں کوئی بات سوجھ گئی ہے۔" محمود نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

"سوجھے گی تب، جب یہ حضرت کچھ آدمی بن جائیں۔"

"تو تمہارے خیال میں میں آدمی نہیں ہوں۔" فاروق نے آنکھیں نکالیں۔

"واقعی فرزانہ، یہ تو تم نے غلط کہا — فاروق تو سو فیصد آدمی ہے۔" محمود مسکرایا۔

"لو، تم بھی شروع ہو گئے۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"اور رہ گئیں تم —" فاروق چہکا۔

"بس، معلوم ہو گیا — ہم ڈیڑھ سو روپے حاصل نہیں کر سکیں گے۔" فرزانہ نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"اگر ارادہ مضبوط ہو تو انسان کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔" فاروق نے بڑے بوڑھوں کے انداز میں کہا۔

"جی ہاں، خاص طور پر مذاق کرنا تو بالکل بھی ممکن نہیں۔" فرزانہ بولی۔

"آج بحث لمبی چھڑ گئی ہے۔ کیا تم دونوں اسے ختم کر کے اصل بات کی طرف نہیں پلٹ سکتے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"پلٹے بغیر بھی اصل بات شروع ہو سکتی ہے۔" فاروق شریر انداز میں مسکرایا۔

"ارے بھائی تو شروع کر بھی دو۔" محمود نے تقریباً چلا کر کہا۔

"تم تینوں لڑ تو نہیں رہے ہو؟" باورچی خانے سے بیگم جمشید نے محمود کی آواز سن کر کہا۔

"نہیں امی جان، سوچ رہے ہیں کہ ابا جان کہاں گئے ہیں۔" فرزانہ نے بلند آواز میں کہا۔

"لیکن اتنی اونچی آواز میں۔" بیگم جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

تینوں کو ہنسی آ گئی — آخر ایک بار پھر وہ اصل موضوع کی طرف آ گئے اور سنجیدگی سے سوچنے لگے۔

"ترکیبیں سوچنے میں فرزانہ کا ذہن ہم دونوں سے تیز ہے۔ اس لیے اسے ہی کوئی ترکیب بتانی چاہیے۔" محمود بولا۔

"یقیناً — یہ کام اسی کا ہوگا۔" فاروق نے تائید کی۔

"میرے ذہن میں ایک بات تو یہ آ رہی ہے کہ ابا جان نے اس جگہ جانے کے لیے بہت ہی خاص تیاری کی ہے اور دوسری یہ کہ انھوں نے کسی کو بھی یہ نہیں بتایا کہ انھیں کہاں جانا ہے — دونوں باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی اہم جگہ گئے ہیں۔ اب یہ تم سوچو، ہم یہ کیسے معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ بہت ہی اہم جگہ کونسی ہو سکتی ہے۔" فرزانہ کہتی چلی گئی۔

"گڈ، میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ اس اہم جگہ آج کوئی خاص بات ہے۔" محمود بولا۔

"وہ مارا — ہمیں آج کا اخبار دیکھنا چاہیے۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

اخبار لایا گیا۔ اس کی ایک ایک خبر کو غور سے پڑھا گیا۔ ایک خبر پر تینوں کی نظریں چپک کر رہ گئیں — دوست ملک کا وزیر اعظم ان دنوں ان کے ملک میں آیا ہوا تھا اور آج اسے شہر کے نیشنل ہال میں دعوت دی جا رہی تھی۔ خبر تو صرف اتنی ہی تھی، لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ کے لیے بہت اہم تھی۔ نیشنل ہال ایک بہت خوب صورت عمارت تھی۔ اس کے چاروں طرف باغ تھا۔ عمارت میں چاروں طرف دروازے تھے اور ان دروازوں سے باغ کی خوشبودار ہوائیں اندر آتی تھیں کیونکہ باغ

میں دنیا بھر کے پھولوں کے پودے لا کر لگائے گئے تھے ـــ یہ باغ حکومت کا تھا اور صرف خاص قسم کے مہمانوں کی دعوت کے لیے استعمال ہوتا تھا؛ ورنہ عام طور پر یہ بند رہتا تھا ـــ اس کی حفاظت اور نگرانی کے لیے پولیس کی کافی تعداد ہر وقت موجود رہتی تھی ـــ پولیس کی اس پارٹی کا انچارج انسپکٹر فیروز خان تھا جو بہت سخت آدمی تھا۔ اسے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ کسی بھی شخص کو نیشنل ہال میں تلاشی لیے بغیر اندر نہ جانے دے ـــ جب کوئی تقریب ہوتی، کسی مہمان کو دعوت دی جاتی تو وہ بیرونی دروازے پر ڈٹ جاتا اور ہر آنے والے کی تلاشی لے کر اندر جانے دیتا، تلاشی دینے والے کوئی اعتراض نہیں کر سکتے تھے ـــ کیونکہ نیشنل ہال میں آنے والے مہمان بہت اہم ہوتے تھے اور ان کی حفاظت کی ذمے داری ملک اور قوم پر عاید ہوتی تھی۔

"اب ہم یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہم مبلغ ڈیڑھ سو روپے جیت چکے ہیں ـــ" آخر محمود نے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے ابا جان کبھی نیشنل ہال نہیں گئے ـــ" فرزانہ نے اعتراض کیا۔

"ہو سکتا ہے، کسی خاص وجہ سے انہیں بلایا گیا ہو ـــ" فاروق نے خیال پیش کیا۔

"مجھے تو اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ نیشنل ہال میں ہی گئے ہیں۔ ارے، مجھے تو اپنے ایک دوست کو فون کرنا تھا ـــ" اچانک محمود کو خیال آیا۔

"ہمیں بھی یقین ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ پورے اخبار میں اور کوئی ایسی خبر

نہیں ہے ـــ" فرزانہ بولی۔

"بالکل ٹھیک ـــ" فاروق نے کہا۔

"بس تو ٹھیک ہے۔ یہ مجلس اب برخاست کی جاتی ہے۔ ابا جان آئیں گے تو ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ نیشنل ہال میں گئے تھے ـــ میں ذرا اپنے دوست کو فون کر آؤں۔"

"آخر فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"وہ سکول سے میری ایک کتاب اپنے بستے میں رکھ کر لے گیا ہے۔ اسے یاد دلانا ہے کہ کل کتاب لیتا آئے۔"

"تب تو ضرور فون کرو۔" فرزانہ مسکرائی۔

محمود اٹھ کھڑا ہوا ـــ وہ بیگم شیرازی کے گھر میں داخل ہوا اور ان سے اجازت لے کر ان کے ڈرائنگ روم میں آگیا ـــ یہاں فون موجود تھا۔ اس نے فون کرنے کے لیے ریسیور کان سے لگایا ہی تھا کہ ایک آواز سنائی دی:

"جی ہاں، عمارت میں بم رکھ دیا گیا ہے اور آپ کے حکم کے مطابق بم کھانے والے ہال میں نہیں رکھا۔"

"بس ٹھیک ہے ـــ وزیر اعظم کو ٹھیک نو بجے کھانا پیش کیا جائے گا ـــ"

"آپ بے فکر رہیں، جونہی وزیر اعظم پہلا لقمہ منہ میں ڈالیں گے، عمارت اڑ جائے گی۔ نہ عمارت کا نام و نشان رہے گا اور نہ عمارت میں موجود لوگوں کا ـــ"

"گڈ، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ نگرانی کا کام کسے سونپا

گیا ہے۔"

"جی ہاں، انسپکٹر جمشید کو۔"

"اور یہی ایک بات فکر میں ڈالنے والی ہے۔" پہلی آواز نے کہا۔

"اس میں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنا کام کرو۔ اس کا انتظام میں کر چکا ہوں۔"

"بہت بہتر۔"

آوازوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ محمود کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر نیچے لٹکنے لگا۔

حملہ اور بچاؤ

انسپکٹر جمشید کی موٹر سائیکل پوری رفتار سے اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ انہیں وہاں ٹھیک ساڑھے سات بجے پہنچنا تھا — وہ گھر سے سات بجے چلے تھے، اس لیے انہیں اطمینان تھا کہ عین وقت پر پہنچ جائیں — شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔

اچانک انہیں اپنی موٹر سائیکل کی رفتار ہلکی کرنا پڑی۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی چیز پڑی تھی۔ وہ ہوشیار ہو گئے۔ ان کا ذہن ایک دم جاگ اٹھا — ایک خیال تیزی سے آیا — کیا وہ..... کسی مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں — پھر جونہی وہ اس چیز کے نزدیک پہنچے، انہوں نے ایک دم بریک لگائے۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی شخص اوندھے منہ پڑا تھا — اس کے پاس سڑک پر خون بھی پھیلا ہوا تھا۔

انہوں نے دائیں بائیں ایک نظر ڈالی۔ چند سیکنڈ سوچتے رہے۔ انسانی فرض انہیں پکار رہا تھا — ہو سکتا ہے، اس شخص میں ابھی کچھ زندگی باقی ہو، اس مصیبت میں اس کو فوراً ہسپتال پہنچانا ان کا فرض تھا — دوسری طرف انہیں ٹھیک ساڑھے سات بجے اپنی ڈیوٹی دینے کے لیے ایک جگہ پہنچنا تھا۔

آخر انہوں نے سوچا، اس آدمی کی جان بچانا زیادہ ضروری ہے — ہاں، اگر یہ مر چکا ہو گا تو پھر میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر ڈیوٹی کے مقام پر پہنچوں گا اور

وہاں سے لاش اٹھوانے کا بندوبست کروں گا۔

یہ سوچ کر وہ موٹر سائیکل پر سے نیچے اتر آئے اور لاش کی طرف بڑھے۔ سڑک پر پھیلے ہوئے خون سے بچنے کے لیے انہیں چکر کاٹ کر لاش کے قریب جانا پڑا۔ پھر جونہی وہ لاش پر جھکے، ایک ساتھ تین فائر ہوئے۔ انسپکٹر جمشید پھرتی سے سڑک پر گر گئے ——— اس کے ساتھ ہی دو زبردست دھماکے ہوئے۔ وہ سمجھ گئے کہ موٹر سائیکل کے دونوں ٹائر پھٹ چکے ہیں۔

انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی ——— چند سیکنڈ اسی عالم میں گزر گئے۔ پھر ان کے پاس سڑک پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور ذرا بلند آواز میں بولا:

"اس کا کام ختم ہوگیا ——— آجاؤ۔"

فوراً ہی دوڑتے قدموں کی آواز آئی اور تین لمبے چوڑے نوجوان ان کے قریب آ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر ان میں سے ایک بولا:

"دیکھا، اگر ہم کبوتروں کا خون سڑک پر نہ پھیلاتے تو یہ اتنی آسانی سے مار نہ کھاتا ———"

"آؤ اب چلیں ———" دوسرے نے کہا۔

"ہاں، ہمارا یہاں کام ختم ہوگیا ———" تیسرا بولا۔

"لیکن پہلے یہ تو دیکھ لو، اس کے گولی کہاں لگی ہے۔ اپنا اطمینان تو کر لو۔" اس نے کہا جو سڑک سے اٹھا تھا۔

"اندھیرے میں کیسے دیکھیں گے کہ گولی کہاں لگی ہے ———" پہلے نے منہ بنا کر کہا۔

"اس نے پوچھا تو کیا جواب دیں گے؟" چوتھے نے کہا۔

"اچھا بابا۔"

پہلا بولا اور انسپکٹر جمشید کے کپڑوں پر ہاتھ پھیرنے لگا ——— اچانک وہ کئی فٹ اونچا اچھلا ——— ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک ہولناک چیخ بھی نکلی۔ باقی تینوں بری طرح بوکھلا گئے ——— انسپکٹر جمشید نے انہیں سنبھلنے کی مہلت نہ دی ——— اپنے دو ہاتھوں سے انہوں نے دو آدمیوں کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیں اور تیسرے کو ٹانگیں رسید کیں۔ تینوں دھڑام سے گرے۔ پہلا تو یونہی زمین پر گرنے کے بعد بے ہوشی کے مزے لوٹ رہا تھا۔

ان کے گرتے ہی وہ سڑک پر سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ پھر ان میں سے جو بھی اٹھا، ان کے جوتے کی ٹھوکر اس کی پسلیوں پر لگی۔ چند منٹ بعد وہ بے سدھ پڑے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے دونوں ہاتھ جھاڑے۔ موٹر سائیکل کی روشنی میں ان کے چہروں کو غور سے دیکھا اور پھر زور سے چونکے۔ ان میں سے ایک کا ایک کان غائب تھا اور اس کی جگہ صرف ایک سوراخ تھا۔ وہ اس آدمی کو جانتے تھے، اس لیے اسے دیکھ کر چونکے تھے، اس کان کٹے کا نام شرفو تھا ——— کئی بار کا سزا یافتہ تھا اور ہمیشہ مار کاٹ کے سلسلے میں پکڑا گیا تھا ——— انسپکٹر جمشید ان چاروں کو گرفتار کر کے نہیں لے جا سکتے تھے اور پھر انہیں تو ساڑھے سات بجے ایک اہم جگہ پہنچنا تھا۔ دفعتاً انہیں اپنے موٹر سائیکل کا خیال آیا، وہ تو بے کار ہو چکی تھی ——— ان کا سر گھوم گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ وقت پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔

اچانک ہی انہوں نے ایک فیصلہ کیا۔ موٹر سائیکل اور ان چاروں کو جوں کا

توں چھوڑا اور سرپٹ بھاگنے لگے — جس سڑک پر پہلے ان کی موٹر سائیکل بھاگ رہی تھی، اس پر اب وہ خود بھاگ رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں شاید اس قدر تیز کبھی نہ بھاگے ہوں گے۔ اُن کا ذہن اُن کی ٹانگوں سے بھی تیز چل رہا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے...... مجھ پر یہ حملہ کیوں ہوا ہے — کیا یہ چاروں مجھ سے اپنی دشمنی نکالنا چاہتے تھے، لیکن نہیں — اس صورت میں انہیں موٹر سائیکل کے ٹائر پھاڑنے کی کیا ضرورت تھی، وہ صرف مجھ پر فائر کرتے — تو — تو کیا یہ مجھے نیشنل ہال جانے سے روکنا چاہتے تھے، آخر کیوں؟ کیا وہاں کسی گڑبڑ کا امکان ہے — اوہ — اف خدا، اگر یہی بات ہوئی تو — پھر تو میرا وہاں جلد از جلد پہنچنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی انہیں کسی چیز کا ہوش نہ رہا — بس دھن تھی تو صرف نیشنل ہال پہنچنے کی —

اور آخر آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر وہ نیشنل ہال کے دروازے پر پہنچ گئے۔ وہ بھی اس حال میں کہ ان کا سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول اور پچک رہا تھا — حلق خشک ہو رہا تھا — سر کے بال بکھر گئے تھے اور تھوڑی دیر پہلے انہوں نے جو تیاریاں کی تھیں، وہ سب دھری کی دھری رہ گئیں؛ البتہ ان کا پستول ابھی تک جیب میں موجود تھا —

دروازے پر کھڑے انسپکٹر فیروز نے انہیں اس حالت میں دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور پھر تیزی سے ان کی طرف بڑھا:

"خیریت تو ہے جناب، مجھے افسرانِ اعلیٰ کی طرف سے ہدایات ملی تھیں کہ آج نگرانی کے فرائض آپ انجام دیں گے اور میں آپ کی ماتحتی میں کام کروں گا......

مگر...... آپ اس حال میں — یہ کیا چکر ہے؟"

"یہ سب تو میں پھر بتاؤں گا۔ پہلے آپ یہ بتائیں کہ یہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"جی ہاں، ہر طرح خیریت ہے۔"

"اس وقت تک کون کون آ چکا ہے؟"

"آپ کے محکمے کے تمام افسران آ چکے ہیں — اور بھی بڑے بڑے آدمی اور شہر کے خاص آدمی آ چکے ہیں۔"

"اوہ —"

ان کے منہ سے نکلا، پھر انہوں نے انسپکٹر فیروز سے کہا:

"اچھا، آپ دروازے پر ہی ٹھہریں اور اپنے آدمیوں کو چاروں طرف پھیلا دیں۔ انہیں چوکس رہنے کا حکم دیں — کیونکہ میرے خیال میں خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔"

"جی، کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"پھر بتاؤں گا — ذرا میں ایک نظر اندر ڈال آؤں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ فیروز انہیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

وہ اسی حال میں اندر داخل ہوئے — سامنے ہی کچھ افسر اور معزز شہری گھاس پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ان میں ان کے محکمے کے آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب تو تھے ہی، خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی تھے۔ چاروں انہیں اس حال میں دیکھ کر بوکھلا اٹھے — اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے — انسپکٹر جمشید یہ

کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے:

"میں ابھی آیا ۔۔"

"ارے، اسے کیا ہوا؟"

پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا لیکن اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ وہ سیدھے ٹیلیفونوں والے کمرے میں آئے۔ اس کمرے میں تین چار میزوں پر کئی فون رکھے تھے تاکہ افسران اور معزز شہری ایک ہی وقت میں فون کر سکیں۔ وہ تیزی سے ایک فون پر جھکے اور اپنے دفتر کے نمبر ڈائل کیے ۔۔ آج کے لیے انھوں نے اکرام کو ہدایت کی تھی کہ جب تک نیشنل ہال کی تقریب ختم نہ ہو جائے اور وہ انہیں فون نہ کر دیں، اس وقت تک وہ دفتر میں موجود رہے۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا:

"میں اکرام بول رہا ہوں جناب ۔۔"

"جنوبی سڑک پر میری موٹر سائیکل پڑی ہے۔ اس کے پاس ہی تمہیں چار بے ہوش آدمی بھی ملیں گے، انہیں لے کر دفتر میں پہنچو۔ میں وہیں آؤں گا ۔۔ ہاں، ان میں سے ایک کا کان کٹا ہوا ہے۔"

"جی ۔۔"

اکرام ہکا بکا رہ گیا ۔۔ لیکن انسپکٹر جمشید تو فون بند بھی کر چکے تھے۔

وہ واپس باغ کے اس حصے میں آئے جہاں سے ابھی گزر کر اندر گئے تھے اور آتے ہی آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کی طرف دیکھ کر بولے:

"کیا آج کا پروگرام کسی اور دن پر نہیں ٹالا جا سکتا؟"

"کیا مطلب؟" دونوں نے ایک ساتھ چونک کر کہا۔

"اور تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے اور تمہیں یہاں ساڑھے سات بجے پہنچنا تھا جب کہ اب آٹھ بج رہے ہیں۔" ڈی آئی جی نے جواب طلب لہجے میں کہا۔

"ان باتوں کا جواب تو میں دے ہی لوں گا ۔۔ پہلے یہ بتائیں کہ ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں؟"

"بالکل نہیں ۔۔"

"وہ کیوں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"اس لیے کہ مہمان وزیر اعظم کو ہم کیا جواب دیں گے۔"

"اور اگر تقریب اس جگہ کی بجائے کہیں اور منائی جائے تو کیا خیال ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ صدر مملکت اپنے عملے کے ساتھ انہیں لینے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں ۔۔ تم یہ بھی تو بتاؤ کہ آخر یہ سب باتیں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھ پر راستے میں حملہ ہوا ہے ۔۔ میری موٹر سائیکل کے دونوں ٹائر گولیاں مار کر پھاڑ دیے گئے ہیں اور خود میں بال بال بچا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے، یہ تمہارے کچھ ذاتی دشمنوں کی حرکت ہو ۔۔ اس کا ہمارے مہمان سے کیا تعلق؟" آئی جی صاحب نے اعتراض کیا۔

"میں اپنی موٹر سائیکل سے اتر کر ایک لاش کی طرف بڑھ چکا تھا۔ اس

صورت میں صرف مجھ پر گولی چلائی جا سکتی تھی، لیکن انہوں نے خاص طور پر موٹر سائیکل پر گولیاں چلائیں ۔۔۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھے یہاں آنے سے روکنا چاہتے تھے۔"

انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

"تم نے کیا کہا، تم ایک لاش کی طرف بڑھ رہے تھے؟" ڈی آئی جی صاحب نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں، ان میں سے ایک سڑک پر لاش بن کر لیٹ گیا تھا۔ اس کے پاس سڑک پر خون بھی پھیلا دیا گیا تھا، شاید انہوں نے کسی جانور کا خون استعمال کیا تھا ۔۔۔ اگر میں خون کو نہ دیکھتا تو ہرگز نہ رکتا۔"

"ہوں ۔۔۔ تو تمہارا خیال ہے، اس جگہ ہمارے معزز وزیر اعظم کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

آئی جی صاحب نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ۔۔۔"

"ٹھیک ہے، لیکن غور سے سنو ۔۔۔ پروگرام بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ ہمارے ملک کی عزت کا سوال ہے اور اگر مہمان وزیر اعظم پر کوئی آنچ آئی تو ہمارے تعلقات ان کے ملک سے خراب ہو جائیں گے جب کہ دونوں ملکوں کا دوست رہنا بہت ضروری ہے ۔۔۔ اگر ہم دوست نہیں رہتے تو ہمارا پڑوسی ملک جو ہمارا بدترین دشمن ہے، ہمارے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن جائے گا۔ اس صورت میں ہم کہیں کے نہ رہیں گے ۔۔۔ اگر یہ سازش ہے تو تمہیں اس سازش کا توڑ

کرنا ہوگا اور تمہارے پاس صرف پینتالیس منٹ رہ گئے ہیں ۔۔۔ ٹھیک نو بجے مہمان کو کھانا پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد کافی کا دور ہوگا، پھر وہ ایک مختصر سی تقریر کریں گے اور یہاں سے قصر ناؤس کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ تم پر ایک بہت بڑی ذمے داری آن پڑی ہے۔"

یہ کہہ کر آئی جی صاحب خاموش ہو گئے ۔۔۔ سب لوگ سکتے کے عالم میں ان کی باتیں سن رہے تھے۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کہ یہ سب انسپکٹر کا وہم ہو اور حملہ آور ان کے اپنے دشمن ہی ہوں۔"

افسران میں سے ایک نے کہا ۔۔۔ یہ ملک عطا خان تھے، ایک بڑے آفیسر ۔۔۔

"ٹائروں کا پھاڑا جانا شک میں مبتلا کر رہا ہے نا۔" ڈی آئی جی صاحب نے ملک عطا خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں، یہ بات بہت اہم ہے۔"

"بس پھر، تمہیں مکمل اختیار دیا جاتا ہے ۔۔۔ تم جو جی چاہے کر سکتے ہو ۔۔۔ جس پر شک گزرے، اسے گرفتار کر سکتے ہو ۔۔۔ چاہے وہ میں ہی کیوں نہ ہوں۔ تمہیں ہر حال میں اس سازش کو ناکام بنانا ہے ۔۔۔ یاد رکھو، ملک کی سلامتی اسی میں ہے کہ مہمان وزیر اعظم یہاں سے بخیر و عافیت واپس جائیں۔"

"بہت بہتر، ایسا ہی ہوگا ۔۔۔ میں ابھی سے انتظامات شروع کیے دیتا ہوں۔ آپ مجھے مکمل اختیارات دے رہے ہیں نا ۔۔۔" انہوں نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بالکل۔"

"میں جسے چاہوں، گرفتار کرسکتا ہوں۔" انہوں نے پھر کہا۔

"ہاں، سوائے صدرِ مملکت اور مہمان وزیرِ اعظم کے۔"

"ٹھیک ہے، اب آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

انہوں نے کہا اور ایک بار پھر فون والے کمرے کی طرف دوڑے۔

پکڑو انہیں

محمود بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا ان تک پہنچا ــــ وہ اسے اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئے۔

"خیر تو ہے؟" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"ابا جان خطرے میں ہیں ــــ چلو اٹھو۔" محمود بولا۔

"بات کیا ہے؟" فاروق نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ بات بتانے کا وقت نہیں ہے۔ فوراً اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔"

"چلو۔"

دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بیرونی دروازے کی طرف لپکے۔

"کیا بات ہے، تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟" پیچھے سے بیگم جمشید کی آواز آئی۔

"ابا جان خطرے میں ہیں، ہم ان کی مدد کے لیے جا رہے ہیں۔ گھبرائیں نہ۔" محمود نے قدم باہر نکالتے ہوئے کہا۔

وہ تقریباً دوڑتے ہوئے سڑک پر نکل آئے، محمود رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا ــــ

"کیا دیکھ رہے ہو؟" فاروق نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ٹیکسی ـــ"

اس کے منہ سے نکلا ـــ اسی وقت ایک خالی ٹیکسی پاس سے گزری۔ محمود نے فوراً ہاتھ اٹھا دیا اور تینوں جلدی جلدی اس میں بیٹھ گئے۔

"نیشنل پارک ـــ" محمود نے کہا۔

"نیشنل پارک ـــ اس میں تو آج داخلہ منع ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں، تم چلو ـــ"

"اچھی بات ہے۔" ڈرائیور نے کہا اور ٹیکسی چلا دی۔

"محمود، تم نے بات نہیں بتائی ـــ" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"تھوڑی دیر خاموش رہو۔ اگر نیشنل پارک تک کے راستے میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی تو فکر کی بات نہیں ہو گی۔" محمود نے کہا۔

"اور اگر کوئی خاص بات ہوئی تو کیا فکر کی بات ہو گی؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"شاید ـــ"

"تم تو اپنے دوست کو فون کرنے گئے تھے ـــ کیا تمہیں اس دوست نے کوئی اطلاع دی ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی کچھ نہ پوچھو ـــ"

"اچھا بھائی نہ بتاؤ ـــ" فاروق نے تنگ آ کر کہا۔

محمود نے آنکھوں کے اشارے سے انہیں بتایا کہ ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے وہ اصل بات نہیں بتا سکتا۔ دونوں سمجھ گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

"نیشنل پارک کو تو نہ جانے کتنے راستے جاتے ہوں گے ـــ" کچھ دیر بعد فاروق کو اچانک خیال آیا۔

"ہاں، لیکن ہمارے گھر سے جو سڑک نیشنل پارک کو جاتی ہے، وہ یہی ہے۔" محمود نے بتایا۔

"اور یہ راستہ ہے بھی مختصر ـــ" ڈرائیور بولا۔

"تب تو ٹھیک ہے ڈرائیور صاحب ـــ آپ ذرا تیز نہیں چل سکتے ـــ" فاروق نے پوچھا۔

"کیوں نہیں، کیا آپ لوگوں کو جلدی ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"جی کچھ زیادہ ہی جلدی ہے ـــ" فاروق نے معصومیت سے کہا اور پریشانی کے اس عالم میں بھی انہیں ہنسی آ گئی ـــ ڈرائیور نے بھی مسکرا کر رفتار بڑھا دی، لیکن پھر فوراً ہی رفتار کم بھی کر دی۔

"کیا آپ ہم سے مذاق کے موڈ میں ہیں؟" فاروق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں، وہ دیکھیے ـــ سڑک پر کچھ پڑا ہے۔" اس نے بتایا۔

تینوں نے چونک کر دور دیکھا، واقعی کچھ پڑا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے انہیں صاف نظر نہ آ سکا ـــ انہوں نے اس پر نظریں جما دیں ـــ آخر وہ نزدیک پہنچ گئے۔ تینوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ یہ ان کے والد کی موٹر سائیکل تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگا کر ٹیکسی آگے نکال لے جانا چاہا:

"ذرا ٹھہریں ڈرائیور صاحب۔"

اس نے گاڑی ایک طرف کر کے روک لی۔ تینوں نیچے اتر آئے۔ موٹر سائیکل

کے دونوں ٹائر پھٹے دیکھ کر انہیں اتنی پریشانی نہیں ہوئی جتنی سڑک پر پھیلے ہوئے خون کو دیکھ کر ۔۔۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ خون کسی دشمن کا ہو۔" فرزانہ بولی ۔

"بالکل ہو سکتا ہے ۔۔۔" فاروق نے کہا ۔

"پھر اب ہم کیا کریں؟" فرزانہ نے پوچھا ۔

"یہاں آس پاس کوئی نہیں ہے ۔۔۔ ابا جان کا نیشنل ہال میں پہنچنا بہت اہم تھا، اس لیے انھوں نے ہر حال میں وہاں پہنچنے کی کوشش کی ہو گی ۔ اب یہ ہمیں وہاں چل کر ہی معلوم ہو گا کہ وہاں پہنچے یا نہیں۔" محمود نے کہا ۔

"ٹھیک ہے ۔۔۔" فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ کہا ۔

تینوں دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ گئے ۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی ۔

"کیا یہ موٹر سائیکل آپ کے کسی عزیز کی تھی؟" ڈرائیور نے پوچھا ۔

"ہاں، ہمارے والد صاحب کی ہے۔" فاروق بولا ۔

"شاید ان پر حملہ کیا گیا ہے ۔۔۔ دونوں ٹائر پھٹے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ۔۔۔" محمود نے سرسری لہجے میں کہا ۔

"تب تو آپ کو سب سے پہلے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے۔" اس نے مشورہ دیا ۔

"نہیں، ہم پہلے نیشنل ہال تک جائیں گے ۔ اس کے بعد کچھ اور کریں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی ۔۔۔"

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ نیشنل ہال کے سامنے اترے ۔ عمارت اور باغ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا ۔۔۔ ہزاروں رنگین بلب جل اور بجھ رہے تھے ۔ پولیس کے جوان رائفلیں لیے چاروں طرف کھڑے تھے ۔ انھوں نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور نیشنل ہال کے دروازے کی طرف لپکے ۔

"محمود، تم نے ہمیں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔" فرزانہ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا ۔

"وقت ہی کہاں ملا ہے ۔۔۔ اگر ابا جان اندر بخیریت موجود ہوئے تو اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے، تم آج ہیرو بننے کے چکر میں ہو۔" فاروق نے جل کر کہا ۔

"مجھے ابا جان کی فکر ستا رہی ہے۔" محمود نے کہا ۔

اتنے میں وہ دروازے پر پہنچ چکے تھے ۔ یہاں انسپکٹر فیروز اپنے پندرہ بیس ماتحتوں کے ساتھ موجود تھا ۔۔۔ انہیں دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک اٹھا اور گرج کر بولا :

"ٹھہرو، کون ہو تم؟"

اس نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا ۔۔۔ محمود نے گھبرا کر کہا :

"ہمیں اندر جانا ہے۔"

"تم اندر نہیں جا سکتے ۔۔۔ آج اندر داخلہ صرف کارڈوں کے ذریعے ہو رہا ہے ۔ کیا تمہارے پاس کارڈ ہیں؟" فیروز نے اس خیال سے کہا کہ کہیں یہ

پیچھے کسی بڑے آفیسر کے نہ ہوں۔

"نہیں، ہمارے پاس کارڈ نہیں ہیں۔" محمود نے کہا۔

"تب تم یہاں سے ہٹ جاؤ۔"

"لیکن ہمارا اندر جانا بہت ضروری ہے ـــ اگر ہمیں اندر نہ جانے دیا تو اندر موجود سب لوگ پچھتائیں گے۔"

"کیا مطلب، یہ کیا بکواس ہے۔" اس نے غصے میں آکر کہا۔

"یہ بکواس نہیں ہے، حقیقت ہے۔ ایسی حقیقت کہ اگر میں آپ کو بتا دوں تو آپ کے ہوش اڑ جائیں۔"

"خبردار، میرے ہوش اڑانا اس قدر آسان نہیں ہے۔"

"محمود، تم وقت ضائع کر رہے ہو۔" فاروق نے اسے خیال دلایا۔

"اوہ ہاں ـــ"

محمود نے کہا اور تیزی سے جھک کر تیر کی طرح دروازے میں داخل ہو گیا ـــ

یہ سب ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ہوا ـــ انسپکٹر فیروز بوکھلا گیا اور ارے پکڑو انہیں، کرتا اس کے پیچھے بھاگا ـــ فاروق اور فرزانہ کو بھی موقع مل گیا ـــ انسپکٹر فیروز کے پیچھے وہ بھی اندر داخل ہو گئے۔ دو کانسٹیبل ان کے پیچھے بھاگے۔

* * *

جنوبی سڑک پر سب انسپکٹر اکرام کی جیپ دوڑ رہی تھی۔ وہ ایک فرض

شناس آدمی تھا اور اپنے افسر پر جان چھڑکتا تھا ـــ ان کے احکامات کی حرف بہ حرف تعمیل کرنا اس کی خاص عادت تھی۔ اس وقت وہ اپنے پانچ ماتحتوں کے ساتھ آیا تھا۔ پانچوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ چاروں بے ہوش آدمیوں کے ساتھی وہاں پہنچ جائیں اور ان سے مقابلہ کرنا پڑے۔ یوں بھی وہ کان کٹے سے اچھی طرح واقف تھا وہ ایک خطرناک آدمی تھا۔

آخر اسے انسپکٹر جمشید کی موٹر سائیکل نظر آ گئی ـــ اس نے جیپ کی رفتار آہستہ کر لی۔ پھر وہ سب جیپ سے اتر پڑے ـــ رائفلیں سیدھی کر لیں۔ موٹر سائیکل سے کچھ فاصلے پر سڑک پر خون پھیلا ہوا تھا، لیکن آس پاس انہیں کوئی بے ہوش آدمی دکھائی نہ دیا ـــ

"ارے، یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" اکرام نے چونک کر کہا۔

"شاید انہیں ہوش آ گیا ہو گا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔" ایک کانسٹیبل نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔" اکرام نے سوچتے ہوئے کہا۔

"پھر اب ہم کیا کریں؟" دوسرے کانسٹیبل نے کہا۔

"موٹر سائیکل کو جیپ پر لاد لو۔"

چند منٹ بعد وہ موٹر سائیکل کو جیپ پر لاد کر واپس جا رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر اکرام نے ایک دکان سے انسپکٹر جمشید کو فون کرنے کے لیے نیشنل ہال کے نمبر گھمائے۔ چند لمحے بعد کسی نے کہا:

"ہیلو، کون صاحب بول رہے ہیں۔"

"میں سب انسپکٹر اکرام ہوں اور انسپکٹر جمشید صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ آپ ان سے بات نہیں کر سکتے۔ وہ اس وقت بے حد مصروف ہیں۔ ویسے اگر آپ کوئی پیغام دینا چاہیں تو دے دیں۔ میں ان تک پہنچا دوں گا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"آپ کون ہیں؟" اکرام نے پوچھا۔

"میری ڈیوٹی ٹیلی فونوں پر ہے۔"

"بہت خوب، تم یوں کرو کہ فوراً انہیں میرے فون کے بارے میں بتاؤ۔ اگر وہ فون سننا پسند نہیں کریں گے تو میں تمہیں پیغام دے دوں گا۔" اکرام نے کہا۔

"بہت بہتر جناب — میں ابھی ان سے معلوم کرتا ہوں۔"

ریسیور میز پر رکھنے کی آواز آئی — شاید وہ چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی:

"آپ نے اپنا نام سب انسپکٹر اکرام بتایا تھا نا —" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میرا نام یہی ہے۔"

"تب پھر آپ فوراً نیشنل ہال پہنچ جائیں۔ انسپکٹر صاحب کو آپ کی یہاں ضرورت ہے۔"

"کیا؟"

اکرام حیران رہ گیا — دوسری طرف سے سلسلہ بند ہو چکا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب انسپکٹر جمشید نے انہیں فون کیا تھا تو انہوں نے ہدایت دی تھی کہ موٹر سائیکل اور بے ہوش آدمیوں کو لے کر دفتر پہنچ جائے۔ وہ وہیں آئیں گے لیکن اب ان کا پیغام مل رہا تھا کہ فوراً "نیشنل ہال" پہنچ جائے۔ کہیں یہ دھوکا نہ ہو، کوئی چکر نہ ہو، لیکن اب وہ نیشنل ہال جانے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا — اس نے جیپ میں بیٹھ کر اسے پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔

سازش کرنے والا

فون والے کمرے میں پہنچ کر انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی بیگم شیرازی کے نمبر گھمائے۔ دوسری طرف سے فوراً ہی جواب ملا:

"بیگم شیرازی پلیز۔"

"خالدہ بہن السلام علیکم، میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ ذرا محمود کو بلا دیں۔" انہوں نے کہا۔

"جی اچھا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا — پھر تھوڑی دیر بعد بیگم جمشید کی آواز آئی:

"تینوں بچے گھر میں نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب، وہ کہاں گئے؟" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر پوچھا۔

"انہیں معلوم ہوا تھا کہ آپ خطرے میں ہیں۔"

"کیا، یہ تم کیا کہہ رہی ہو — بھلا انہیں یہ بات کیسے معلوم ہو گئی؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات انہیں کس طرح معلوم ہوئی، انہوں نے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے کہا تھا کہ ابا جان خطرے میں ہیں۔"

"کمال ہے، ان تینوں کو کالا علم تو نہیں آتا۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

"کیا واقعی آپ خطرے میں ہیں؟"

"خطرے میں تھا — اب تو شاید نکل بھی چکا ہوں — تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ گئے کہاں ہیں۔"

"نہیں، اس سلسلے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"عجیب بات ہے — بہت ہی عجیب — خیر اگر وہ واپس آ جائیں تو انہیں نیشنل ہال میں بھیج دیں۔"

"نیشنل ہال میں — جی بہت اچھا۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

جوں ہی انہوں نے ریسیور رکھا، کمرے سے باہر شور کی آواز سنائی دی — اس کے ساتھ ہی بھاگ دوڑ کی آوازیں بھی آئیں — وہ حیران رہ گئے۔ نیشنل ہال میں شور اور بھاگ دوڑ کی آوازیں — یہ عجیب ترین بات تھی۔ وہ دروازے کی طرف لپکے، لیکن پھر ٹھٹک کر رہ گئے — یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ باہر کوئی خطرہ ہو۔ انہوں نے فوراً اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا — چند لمحے کھڑے باہر کی آوازوں کو سنتے رہے۔ اسی وقت کوئی دروازے کی طرف آیا — وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئے اور دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے — اندر آنے والا ٹیلی فونوں پر نگران تھا — اسے دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے ریوالور جیب میں رکھ لیا اور بولے:

"یہ باہر شور کیسا ہے؟"

"تین بچے اندر گھس آئے ہیں — پولیس والے انہیں پکڑنے کے لیے

دوڑ رہے ہیں لیکن وہ کسی کے قابو میں ہی نہیں آرہے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا کہا، تین بچے ___ ان میں ایک لڑکی بھی تو نہیں؟" انسپکٹر جمشید بری طرح چونکے۔

"جی ہاں، ایک لڑکی ہے اور دو لڑکے ہیں ___"

"اوہ۔"

ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ بے تابی کے عالم میں باہر نکلے۔ وہ سوچ رہے تھے، کیا محمود، فاروق اور فرزانہ یہاں پہنچ گئے۔

باہر انہیں ایک عجیب منظر نظر آیا ___ گھاس کے گول میدان میں سب سے آگے محمود دوڑ رہا تھا ___ اس کے پیچھے انسپکٹر فیروز تھا ___ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر فاروق اور فرزانہ تھے اور ان کے پیچھے بھی دو کانسٹیبل تھے ___ درمیان میں بیٹھے ہوئے لوگ اُٹھ کر اس عجیب و غریب دوڑ کو دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی کہ یہ کیا طوفان بدتمیزی ہے۔ کیا یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں ___ آخر یہ سب کیا ہے ___ پھر وہ انہیں روکنے کے لیے آگے بڑھے۔

* * *

محمود کو اس طرح اندر داخل ہوتے دیکھ کر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے افسران اور دوسرے لوگ حیران رہ گئے ___ پروفیسر داؤد، خان رحمان، آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کا تو حیرت کے مارے برا حال ہو گیا۔ وہ محمود کو

پہچانتے تھے۔ پھر انسپکٹر فیروز کو اس کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر اور بھی حیران ہوئے۔ ڈی آئی جی صاحب انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکنا ہی چاہتے تھے کہ فاروق اور فرزانہ اندر دوڑتے ہوئے آئے ___ انہیں دیکھ کر تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ڈی آئی جی کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ شاید وہ یہ تماشا دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے؟ یہ بچے کون ہیں؟"

ملک عطا خان نے اس دوڑ کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی بھی ہوں، یہاں کیوں آ گھسے ہیں ___ مجھے تو یہ تینوں بچے پاگل لگتے ہیں۔" ایک اور آفیسر نے کہا، ان کا نام سردار داؤد تھا۔

"یہ پاگل نہیں ہیں۔" خان رحمان مسکرائے۔

"بلکہ بہت تیز اور طرار ہیں۔ دیکھ نہیں رہے، پولیس والے ابھی تک انہیں نہیں پکڑ سکے اور اگر یہ دوڑ گھاس پر نہ ہو رہی ہوتی تو میں یہ کہتا کہ ابھی تک پولیس والے ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔ لیکن نیشنل پارک میں گرد کہاں۔" پروفیسر داؤد نے ہنس کر کہا۔

"کیا آپ ان بچوں کو جانتے ہیں؟" سردار داؤد نے پوچھا۔

"صرف میں اور خان رحمان ہی نہیں، شیخ صاحب اور خان صاحب بھی اچھی طرح انہیں جانتے ہیں ___" پروفیسر داؤد کا اشارہ آئی جی اور ڈی آئی جی صاحب کی طرف تھا۔

"آخر یہ بچے کون ہیں؟" ملک عطا خان نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

دوسری طرف دوڑ ابھی تک جاری تھی۔ محمود کا مطلب اس دوڑ سے یہ تھا کہ ان کے والد ضرور اس طرح ان کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور دوڑ کر ان کی طرف آئیں گے اور اگر وہ یہاں نہ ہوئے تو وہ افسران کو اس خوفناک خطرے سے آگاہ کر دیں گے۔ ابھی تک تو ان کے والد انہیں نظر نہیں آئے تھے۔

اچانک ایک آواز نے ان سب کو چونکا دیا:

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

دوڑتے قدم رک گئے — سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ یہ آواز انسپکٹر جمشید کی تھی — وہ ان کی طرف بڑھ رہے تھے، پھر محمود، فاروق اور فرزانہ دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گئے۔

"یہ پارک میں داخل ہونے کا کونسا طریقہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"کیا کرتے ابا جان، ہمیں اندر آنے نہیں دیا جا رہا تھا اور ہمارے پاس ایک بہت خوفناک اطلاع تھی، اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔" محمود نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

انسپکٹر فیروز، کانسٹیبل اور دوسرے لوگ حیران ہو ہو جا رہے تھے۔

"یہ تو میں بعد میں پوچھوں گا کہ تمہارے پاس وہ کونسی خوفناک اطلاع ہے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں خطرے میں ہوں اور یہ کہ مجھے اس جگہ آنا تھا؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

اسی وقت سر داؤد آگے بڑھے۔ یہ صدر مملکت کے دوست تھے اور بہت اثر رسوخ والے تھے۔ انہوں نے سخت آواز میں کہا:

"مسٹر جمشید، یہ بچے کون ہیں؟"

"یہ میرے بچے ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا ان کا اس طرح نیشنل پارک میں داخل ہونا قانونی طور پر درست ہے۔"

"جی نہیں، بالکل غلط ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

"انسپکٹر فیروز، ان بچوں کو گرفتار کر لیا جائے۔" سر داؤد نے غرا کر کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔" ملک عطا خان نے آگے بڑھ کر سر داؤد کی تائید کی۔

"مجھے ان کی گرفتاری پر کوئی اعتراض نہیں — لیکن یہ تینوں ایک بہت اہم خبر لے کر آئے ہیں۔ پہلے انہوں نے انسپکٹر فیروز سے اندر آنے کی اجازت لی تھی۔ جب اجازت نہ ملی تو انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ اب اگر وہ اطلاع ملک اور قوم کے مفاد میں ہوئی تو پھر تو انہیں گرفتار کرنے کی بجائے انعام دیا جانا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"آپ اپنے بچوں کو بچانے کے لیے بہانا بنا رہے ہیں۔" ملک عطا خان تیز لہجے میں بولے۔

"میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتا۔" انسپکٹر جمشید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر فیروز، اگر تم نے فوراً ان تینوں کو گرفتار نہ کیا تو خود کو ملازمت سے الگ سمجھنا۔" ملک عطا خان نے کہا۔

"جناب عالی، مجھے تعمیل کرنے میں قطعاً کوئی اعتراض نہیں، لیکن یہ

انسپکٹر جمشید کے بچے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے پہلے مجھ سے اندر آنے کی اجازت لی تھی، لیکن میں ان سے واقف نہیں تھا، اس لیے انہیں اجازت نہیں دی ۔" انسپکٹر فیروز نے گھبرا کر کہا۔

"میری درخواست ہے کہ پہلے مجھے ان سے وہ اطلاع سن لینے کی اجازت دی جائے جو یہ لے کر آئے ہیں۔ اس کے بعد آپ کے جو جی میں آئے، کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میرا خیال ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" خان رحمان نے آگے بڑھ کر کہا۔

"بالکل، یہ بچے کہیں بھاگے تو جا نہیں رہے۔" پروفیسر داؤد بھی آگے آ گئے۔

"میں بھی ان دو حضرات کی تائید کرتا ہوں۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

ملک عطا خان نے ان تینوں کو گھورا، پھر آئی جی صاحب پر نظریں جما دیں جیسے ان کا خیال پوچھ رہے ہوں۔

"ٹھیک ہے ۔۔۔ کوئی حرج نہیں ہے ۔۔۔ انہیں ہم جس وقت چاہیں گرفتار کر سکتے ہیں۔"

"اگر آپ سب کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی ۔۔۔ لیکن ان تینوں کو وہ اطلاع ہم سب کے سامنے دینا ہوگی۔" ملک عطا خان نے کہا۔

"جی نہیں، ہم وہ سب کے سامنے نہیں دے سکتے، البتہ ابا جان کے ساتھ آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب چل سکتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

آئی جی صاحب نے اس خیال سے فوراً کہا کہ کہیں ملک عطا خان اس پر بھی اعتراض نہ کر دے۔

انسپکٹر جمشید، تینوں بچے اور آئی جی صاحب ان سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔

"ہاں، اب بتاؤ ۔۔۔ وہ کیا اطلاع ہے۔"

"یہ عمارت نو بجے بم سے اڑ جائے گی۔" محمود نے بغیر کسی تفصیل کے ایک دم کہا۔

"کیا؟" ان سب کے منہ سے نکلا۔

ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں ۔۔۔ وہ سکتے میں آ گئے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ تم تینوں ہوش میں تو ہو۔"

"جی ہاں، یہ بالکل سچ ہے۔"

محمود نے کہا اور انہیں تفصیل سے بتانے لگا۔ فاروق اور فرزانہ بھی اس کی کہانی پہلی بار سن رہے تھے، اس لیے وہ بھی حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"اُف خدا، اب کیا ہوگا ۔۔۔ مہمان وزیراعظم تو روانہ ہونے والے ہوں گے۔" آئی جی صاحب بولے۔

"کیا آپ انہیں کچھ دیر کے لیے وہاں نہیں روک سکتے؟" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"آخر کیسے؟ ہم ان سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہاں خطرہ ہے۔" آئی جی صاحب

بولے۔

"تب پھر کیا کیا جائے؟" ڈی آئی جی صاحب نے سوال کیا۔

"معاملہ بہت ٹیڑھا ہے اور وقت بہت کم ہے۔ اس وقت سوا آٹھ ہو چکے ہیں۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے مہمان اور صدرِ مملکت یہاں ہوں گے۔ پہلے انہیں ہلکی پھلکی چیزیں پیش کی جائیں گی اور پھر ٹھیک نو بجے کھانا پیش کیا جائے گا۔ یہی وقت بم پھٹنے کا بتایا گیا ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے پینتالیس منٹ سے پہلے پہلے کرنا ہے۔" آئی جی صاحب بولے۔

"تب پھر ایک ہی صورت ہے۔" آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"اور وہ یہ کہ میں، محمود، فاروق اور فرزانہ کے ساتھ وہ بم تلاش کروں۔ اگر نو بجے سے پہلے وہ بم مل جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر نہ کی جائے اور اگر بم نہیں ملتا تو پھر مجبوری کی حالت میں چند منٹ کے اندر اندر عمارت خالی کرائی جائے ۔۔۔ اس صورت میں مہمان وزیر اعظم کو خطرے سے باخبر کر دیا جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ سازش کی اطلاع عین وقت پر ملی ہے۔"

"بالکل ٹھیک، اب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔" ڈسی آئی جی صاحب بولے۔

"اب آپ چاہیں تو محمود، فاروق اور فرزانہ کو گرفتار کرا دیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جو بچے اس قدر اہم اطلاع لے کر آئیں، انہیں تو قوم کو سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔ میں ملک عطا خان اور سردار داؤد کو سنبھال لوں گا۔ تم اپنا کام کرو۔ بہتر تو یہی

ہو گا کہ تم بم تلاش کر لو۔"

"جی بہت اچھا ۔۔۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا لیکن اس کے لیے مجھے اپنے چند ماتحتوں کو بلانا ہو گا۔"

"تمہیں ہر طرح کا اختیار دیا جاتا ہے جو جی میں آئے کرو۔"

"میں جسے چاہوں، بھری محفل میں گرفتار کر لوں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"ضرور گرفتار کر لینا ۔۔۔ لیکن تم نے یہ بات کیوں پوچھی؟"

"سازش کرنے والا خود بھی کہیں آس پاس ضرور موجود ہو گا۔ ہو سکتا ہے، وہ بم کے قریب ہی کہیں موجود مل جائے۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

ایک لاکھ

انسپکٹر جمشید نے سب سے پہلے اکرام کو فون کیا، وہ موجود نہیں ملا تو انھوں نے نگران سے کہا کہ اگر سب انسپکٹر اکرام کا فون آجائے تو انہیں یہیں آنے کی ہدایت کردی جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے فوٹوگرافروں اور دوسرے ماہرین کو فون کیے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر انھوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لیا اور ایک کمرے میں آئے۔ یہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"تمہارا خیال کیا کہتا ہے، بم کس جگہ ہو سکتا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کھلنے والا ہال اوپر ہے، اس کے نیچے ایک اور ہال ہے۔ بم اس میں ہونا چاہیے۔"

"بات دل کو لگتی ہے۔" محمود بولا:

"نچلا ہال اڑے گا تو اوپر والا خود بخود اُڑ جائے گا اور پھر نچلے ہال کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ٹھیک ہے، آؤ ہم ہال میں چلیں۔"

چاروں ہال میں آئے۔ انھوں نے پہلے تو ہال کا سرسری جائزہ لیا پھر انسپکٹر جمشید بولے:

"میرا خیال ہے، ہال کے دروازے بند کر کے چیک کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔"

انھوں نے ہال کے چوکیدار کو باہر بھیج دیا اور خود تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔

"اب تمام میزوں اور کرسیوں کو غور سے دیکھو، خاص طور سے میز کے پچھلے حصوں کو۔"

انھوں نے حکم دیا اور خود بھی ان کے ساتھ کرسیوں اور میزوں کو دیکھنے لگے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر انھوں نے تمام کرسیاں اور میزیں دیکھ ڈالیں۔

"ان میں سے تو کسی کے ساتھ بم نہیں ہے۔" محمود بولا۔

"اب دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کا جائزہ لینا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں ہدایت دی۔

"ابا جان سیڑھی کے بغیر ہم روشندانوں کا جائزہ کیسے لے سکتے ہیں؟" فاروق نے پوچھا۔

"میز پر میز رکھ کر۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے۔"

انھوں نے سب دروازے دیکھ ڈالے۔ اچانک محمود کو ایک چیز نظر آگئی۔ وہ بڑے زور سے چونکا۔ اس کے منہ سے جوش کی حالت میں نکلا:

"وہ مارا۔"

"خدا کے لیے اس ہال میں کچھ نہ مارو، صرف بم تلاش کرو۔" فاروق نے

کہا۔

"میرا خیال ہے، میں نے بم رکھنے کی جگہ تلاش کر لی ہے۔"

"کیا کہا؟" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"جی ہاں، کیا آپ مجھے کچھ انعام دیں گے۔" محمود نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں، میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔"

"ابا جان، آپ کو ڈیڑھ سو روپے تو پہلے ہی دینے ہیں۔" فرزانہ نے یاد دلایا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے، لیکن یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ محمود، تمہیں بم رکھنے کے لیے کون سی جگہ نظر آئی ہے؟"

"ابا جان، چھت کے....."

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ ہال کے بڑے دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے محمود کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے پر پہنچ کر اس کی چٹخنی گرا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ہال کا چوکیدار ان پر سیاہ رنگ کا پستول تانے کھڑا تھا۔

"اس پستول میں سائیلنسر لگا ہوا ہے۔ گولی چلنے کی آواز بالکل سنائی نہیں دے گی۔"

اس کی آواز سن کر محمود بُری طرح اچھلا۔ انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر پوچھا:

"کیوں، تمہیں کیا ہوا؟"

"ابا جان، یہ وہی آواز ہے جو میں نے فون پر سُنی تھی۔ اس شخص نے کسی کو فون پر پیغام دیا تھا کہ بم رکھ دیا گیا ہے اور وہ ٹھیک نو بجے پھٹے گا۔"

"بہت خوب۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"اندر چلو۔" چوکیدار نے سرد آواز میں کہا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو، وہ کون تھا جسے تم فون کر رہے تھے؟" انسپکٹر جمشید نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔

"میں نے کہا ہے، اندر چلو۔"

انسپکٹر جمشید بھانپ گئے کہ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوں گے، ان کی زندگیاں ختم کر دی جائیں گی، کیونکہ یہ شخص دروازے پر کھڑا تالے کے سوراخ میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ضرور محمود نے اس جگہ کو تاڑ لیا تھا جہاں بم رکھا گیا تھا۔

"بہت اچھا۔"

انہوں نے کہا اور اندر کی طرف قدم پیچھے ہٹائے۔ چوکیدار ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ انہوں نے بچاؤ کے لیے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نیچے جھک کر چوکیدار کے پیٹ میں ایک زوردار ٹکر رسید کی۔ ٹکر اس کے پیٹ میں لگی، اس کے قدم لڑکھڑا گئے، لیکن وہ بھی بہت مضبوط ہاتھ پیر کا مالک تھا، فوراً ہی سنبھل گیا۔ اب اس نے درمیانی فاصلہ زیادہ کر لیا۔ پستول اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تمہارا وار خالی گیا، لیکن میرا وار خالی نہیں جائے گا۔"

"تم بھی بچ نہیں سکو گے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے خبردار کیا۔

"میں اس کمرے کا چوکیدار ہوں — تم زبردستی یہاں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے تمہیں گولی مار دی — میرا بیان یہی ہوگا۔ ساتھ ہی میں کہہ دوں گا کہ میں تمہیں جانتا ہی نہیں تھا۔"

"بہت خوب، واقعی ہوشیار آدمی ہو — ویسے میرا خیال ہے کہ تم مجھے جانتے ضرور ہو — محمود، مجھے فون پر ہونے والی گفتگو تو سناؤ۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں، اس نے کہا تھا کہ نیشنل ہال کی نگرانی کا کام آپ کو سونپا گیا ہے اور یہی بات فکر میں ڈالنے والی ہے۔" محمود نے بتایا۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا نا کہ تم مجھے جانتے ہو — ویسے اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ چوکیدار کے اس بھیس میں میں تمہیں نہیں پہچان سکوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم دلاور ہو۔ اس سے پہلے کئی بار جیل جا چکے ہو اور میرے ہاتھوں بھی دو مرتبہ گرفتار ہو چکے ہو۔"

"مجھے پہچان لیا ہے تو کیا ہوا، یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔" دلاور نے غرا کر کہا۔

"اچھا، مجھے نہیں معلوم تھا۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نے کہا ہے، اندر چلو۔"

"چلو، اندر ہی چلے چلتے ہیں — کاش میں نے تمہیں اس وقت پہچانا ہوتا جب ہم تمہیں ہال سے باہر نکال رہے تھے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید الٹے قدموں اندر آ گئے — اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا — اندر داخل ہوتے ہی دلاور نے فائر جھونک مارا۔

✻ ✻ ✻

سب انسپکٹر اکرام پوری رفتار سے جیپ چلاتا ہوا نیشنل پارک تک پہنچا۔ جیپ سے نیچے اترتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کانسٹیبلوں سے کہا:

"تم یہیں ٹھہرو — اگر ضرورت نہ ہوئی تو میں آ کر بتا دوں گا، تم واپس چلے جانا۔"

"جی اچھا۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا — یہاں اب پھر انسپکٹر فیروز کھڑا تھا۔ اس کے حواس پر اب تک کچھ دیر پہلے کا واقعہ چھایا ہوا تھا — وہ سب انسپکٹر اکرام کو پہچانتا تھا — اس لیے جب اکرام نے اسے بتایا کہ انسپکٹر جمشید نے اسے بلایا ہے تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اندر داخل ہو کر اس نے ادھر ادھر دیکھا — سامنے ہی اسے آئی جی اور ڈی آئی جی کے ساتھ کئی آفیسر اور معزز شہری بیٹھے نظر آتے — وہ گھبرا گیا کیونکہ یہاں تو انسپکٹر جمشید کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے — آخر وہ آگے بڑھا اور باادب ہو کر ڈی آئی جی صاحب سے مخاطب ہوا:

"سر، مجھے یہاں انسپکٹر صاحب نے طلب کیا ہے — کیا آپ بتا سکتے ہیں، وہ کہاں ہیں؟"

"ہاں اکرام، انہیں تمہاری بہت ضرورت ہے، وہ اندر گئے ہیں۔ جا کر دیکھ لو

کہ کہاں ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" اکرام نے پرسکون ہو کر کہا اور اندر کی طرف بڑھا۔

اندر جا کر وہ چکرا کر رہ گیا۔۔۔ یہاں ہال کمرے کے چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے۔ ہال کے اوپر بھی ایک ہال تھا لیکن نیچے آدمی کوئی نہیں تھا جس سے وہ پوچھتا کہ انسپکٹر جمشید کہاں ہیں۔۔۔ اچانک اسے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ عجیب سی آواز۔۔۔ جیسے کوئی شخص کسی دوسرے سے زور سے ٹکرایا ہو۔ آواز ہال کی طرف سے آئی تھی۔ اکرام تیزی سے اس طرف بڑھا۔ ہال کمرے کا بڑا دروازہ عین اس کے سامنے تھا۔۔۔ اس نے دیکھا، دروازے میں اس کی طرف کمر کیے کوئی آدمی کھڑا ہے اور اس کے سامنے انسپکٹر جمشید تھے۔۔۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ اکرام ذرا آگے بڑھا تو چونک اٹھا۔۔۔ اس آدمی کے ہاتھ میں تو پستول تھا۔۔۔ دوسرا لمحہ چکرا دینے والا تھا۔۔۔ اکرام نے ہلکی سی ایک آواز پھر سنی۔۔۔ یہ بھی ویسی ہی آواز تھی لیکن اس مرتبہ وہ جان گیا کہ یہ پستول چلنے کی آواز تھی۔ پستول پر سائیلنسر لگا ہوا تھا، اس لیے بہت معمولی سی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے انسپکٹر جمشید کو اچھلتے دیکھا۔۔۔ ایک بار پھر دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔۔۔ وہ حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگا، کہ کیا یہ کوئی کھیل کھیل رہے ہیں یا مشق کر رہے ہیں۔۔۔ اسی وقت انہوں نے انسپکٹر جمشید کو مسکرا کر کہتے سنا:

"تمہارے دو فائر خالی جا چکے ہیں۔ پستول میں چار گولیاں اور ہیں، وہ بھی

آزما ڈالو۔۔۔ اس کے بعد میری اور تمہاری باتیں ہوں گی۔"

اکرام سمجھ گیا کہ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔۔۔ موت اور زندگی کا معاملہ ہے۔ اب وہ اور انتظار نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ ابھی تک انسپکٹر جمشید کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ اچانک انہوں نے کہا:

"نہ نہ۔۔۔ اسے جان سے نہ مارنا۔"

ان کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی پیچھے سے دلاور پر حملہ کر رہا ہو۔۔۔ دلاور بوکھلا کر مڑا۔ عین اسی وقت انسپکٹر جمشید کی نظر اکرام پر پڑی اور انہیں افسوس ہونے لگا کہ یہ جملہ انہوں نے کیوں کہا۔۔۔

دوسری طرف اکرام بھی گھبرا گیا تھا۔۔۔ دلاور کے مڑتے ہی وہ اس پر جھپٹ پڑا، لیکن اس سے پہلے انسپکٹر جمشید دلاور کی گردن کی ہڈی پر ایک ہاتھ جما چکے تھے۔ وہ لکڑی کے تختے کی مانند فرش پر آ رہا۔۔۔ اکرام نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔۔۔ دلاور ابھی تک بے ہوش نہیں ہوا تھا، لیکن چوٹ زبردست پڑی تھی۔۔۔

"اسے باندھ لو اکرام۔۔۔ یہ غیر ملکی جاسوس کا ساتھی ہے۔ اسے ہم پھانسی کی سزا دلوائیں گے۔"

"نہیں نہیں، میں غیر ملکی جاسوس نہیں ہوں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ بم رکھنا ایک غیر ملکی کا ہی کام ہے اور بم اس نے تمہارے ہاتھوں رکھوایا تھا۔ تم نے اسے فون پر اطلاع بھی دی تھی کہ بم رکھ دیا گیا ہے اور ٹھیک نو بجے پھٹے گا۔" انسپکٹر جمشید نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

"یہ ٹھیک ہے، بم میں نے ہی رکھا ہے اور اس کے حکم پر رکھا ہے لیکن مجھے یہ ہرگز نہیں معلوم کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے۔ بم بھی مجھے اسی نے دیا تھا۔"

"تو تم اسے جانتے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، وہ میرے سامنے جب بھی آتا ہے، منہ پر نقاب ڈال کر آتا ہے۔"

"تم اس کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

"یہ پہلا کام ہے — اس کام کے لیے اس نے ایک ماہ پہلے سے تیاری شروع کر رکھی ہے — ایک ماہ پہلے اس نے مجھ سے بات کی تھی اور بم رکھنے کا معاوضہ ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"تو تم ایک لاکھ کے لالچ میں آ گئے۔"

"جی ہاں، یہی بات ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

اس وقت تک وہ ہال کے اندر آ گئے تھے — اکرام نے بڑا دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا تھا۔

"تم اس طرح بھی نہیں بچ سکتے؛ بہرحال بم تم نے ہی رکھا ہے۔ بم پر سے تمہاری انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے بتایا۔

"کیا میرے لیے بچت کا کوئی راستہ نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک راستہ ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"وہ کونسا؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"تم اس کا نام بتا دو اور عدالت میں بھی یہ اقرار کرنے کا وعدہ کرو کہ اسی

نے تمہیں ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔" انہوں نے تجویز پیش کی۔

"یہ بالکل سچ ہے کہ میں نے اس کی شکل آج تک نہیں دیکھی۔"

"اچھا، ایک دوسری ترکیب بھی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تم اسی طرح اس ہال کی چوکیداری کرتے رہو، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور جیسے بم ابھی تک اپنی جگہ پر موجود ہے — اگر اس کا کوئی آدمی تم تک آئے اور پوچھے کہ سب ٹھیک ہے تو تم اسے جواب دو کہ ہاں، سب ٹھیک ہے — بم پھٹنے کے لیے تیار ہے۔ میں چاہتا ہوں، یہ بات انہیں ہرگز معلوم نہ ہو کہ بم جگہ پر سے ہٹا دیا گیا ہے اور اب وہ عمارت کو نہیں اڑا سکے گا۔" انسپکٹر جمشید نے دوسری تجویز پیش کی۔

"یہ تجویز میرے لیے قابل قبول ہے۔ میں تیار ہوں۔"

"ویسے بم پھٹنے کے وقت تم کہاں جاتے؟"

"ہال سے باہر باغ میں — بم صرف اس ہال کو اڑاتا اور اس میں موجود کوئی آدمی نہ بچتا۔"

"ہوں، ٹھیک ہے — تم دروازے سے باہر چوکیدار بن کر بیٹھ جاؤ — خبردار، اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ حالات بدل گئے ہیں؛ ورنہ تم پھانسی کے تختے سے کسی طرح نہ بچ سکو گے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے دھمکی دی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ایسا ہی ہوگا۔" دلاور نے کہا۔

"ویسے تم اس عمارت کے چوکیدار کب سے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"آج سے ہی — اصل چوکیدار کو یہاں سے اٹھا کر کہیں اور پہنچا دیا

گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اسے کہاں لے جایا گیا ہے؟"

"یہ بات مجھے معلوم نہیں۔" دلاور بولا۔

"ٹھیک ہے — تمہارا پستول ہمارے پاس رہے گا — میرا ایک آدمی تم پر نو بجے تک مسلسل نظر رکھے گا۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تمہارا حشر بہت بُرا ہو گا۔"

"میں وعدہ کر چکا ہوں کہ کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، اب تم بم اتار کر اسے بے کار کر دو۔" انسپکٹر جمشید نے حکم دیا۔

"ابا جان، پہلے محمود سے معلوم تو کر لیں۔ بم کہاں موجود ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ارے ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا — بم کی دریافت کا سہرا تو محمود کے سر ہے — جونہی اس نے منہ سے چھت کا لفظ نکالا تھا، دلاور نے دروازے پر دستک دے دی تھی — کیوں دلاور، کیا بم چھت پر ہے؟" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی — جی — نہیں تو۔" اس نے کہا۔

"محمود، تم بتاؤ — بم کہاں ہے؟"

"جی، چھت کے بیچوں بیچ شیشے کا بنا ہوا جو فانوس لٹک رہا ہے، بم ضرور اس میں رکھا گیا ہے — کیونکہ اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔" محمود

نے بتایا اور وہ چونک اٹھے — دلاور بھی حیران رہ گیا۔

"بہت خوب، میں بھی یہی سمجھتا ہوں — تمہارا خیال ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اس کی تعریف کی۔

"مہمانوں کے آنے کا وقت قریب ہے — آٹھ بج کر پچیس منٹ ہو چکے ہیں۔ دلاور اب ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرو — بم اتار لو۔"

"بہت اچھا۔" دلاور نے کہا اور بڑی میز پر چھوٹی میز رکھ کر اس پر چڑھ گیا۔ پھر اس نے فانوس میں ہاتھ ڈال دیا —

وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے — جونہی اس کا ہاتھ باہر آیا وہ سب دھک سے رہ گئے —

"میں ایک لاکھ روپے حاصل کر کے رہوں گا — ایک زمانہ ہو گیا ہے، مجھے ایک لاکھ روپے حاصل کرنے کی خواہش کرتے۔"

اُس کے یہ الفاظ تیروں کی طرح ان کے کانوں سے ٹکرائے۔ وہ ان سب کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک سٹین گن تھی جس کا رُخ ان کی طرف تھا — اُس نے مسکرا کر کہا:

"ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

پگڑی والا

انسپکٹر جمشید اور تینوں بچوں کے اندر جاتے کے بعد وہ سب لوگ پھر کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے ___ ملک عطا خان اور سردادؤد کا منہ پھولا ہوا تھا جب کہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد برابر مسکرا رہے تھے۔ آخر ملک عطا خان نے جھلا کر کہا :

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر آپ نے انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کو اس قدر ڈھیل کیوں دے رکھی ہے۔ یہ شہر میں غیر قانونی حرکتیں کرتے پھرتے ہیں اور کوئی انہیں ٹوکنے والا بھی نہیں۔ اب اسی وقت کو لے لیں ___ میں نے اس کے تینوں بچوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا لیکن نہ انسپکٹر فیروز نے تعمیل کی اور نہ آپ نے میرا ساتھ دیا، آخر کیوں ! یہ انسپکٹر جمشید کتنا بڑا آفیسر ہے۔" اس کا رخ آئی جی صاحب کی طرف تھا۔

"وہ صرف ایک انسپکٹر ہے لیکن اس نے ملک اور قوم کے لیے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے ان کا دسواں حصہ بھی کام کر کے نہ دکھایا ہو گا اور اس کے بچے بھی ہمیشہ ایسے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔" آئی جی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"پھر بھی اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہر جگہ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ

اڑا بیٹھیں۔"

"جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ڈی آئی جی صاحب بولے :

"یہ جب بھی کہیں ٹانگ اڑاتے ہیں، کسی وجہ سے ہی اڑاتے ہیں۔"

"آپ ناحق ان کی طرفداری کر رہے ہیں ___ کیا آپ بتا سکتے ہیں، اس وقت وہ کون سی خاص وجہ تھی کہ اس کے بچے اتنی اہم جگہ شور مچاتے ہوئے داخل ہو گئے۔" ملک عطا خان نے جھنجلا کر کہا۔

ڈی آئی جی صاحب نے اصل وجہ بتانے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ انہیں یاد آ گیا، انسپکٹر جمشید نے معاملے کو راز میں رکھنے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے سنبھل کر کہا :

"یہ تو ابھی تک معلوم نہیں ہوا کہ وہ کونسی خاص وجہ ہے ؛ بہرحال مجھے یقین ہے کہ وجہ ضرور خاص ہی ہو گی۔"

"تو انھوں نے آپ کو بھی وجہ نہیں بتائی۔"

"جی نہیں۔"

"آخر کیوں ؟ کیا آپ اس کے افسر نہیں ہیں ؟" ملک عطا خان نے جھلا کر پوچھا۔

بے شک ہوں، لیکن انسپکٹر جمشید بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ جب چاہے، جہاں چاہے کسی معاملے میں وجہ بتائے بغیر دخل دے سکتا ہے۔" آخر آئی جی صاحب نے بھی تیز ہو کر کہا ___ وہ انسپکٹر جمشید کے بہت بڑے قدردان تھے اور یہی حال ڈی آئی جی صاحب کا بھی تھا۔ وہ انہیں بیٹوں کی طرح عزیز

رکھتے تھے۔

"کیا مطلب؟ یہ کیا بات ہوئی؟" سر داؤد نے چونک کر کہا۔

"جی ہاں، صدر مملکت کی طرف سے اسے اس قسم کا تحریری اجازت نامہ ملا ہوا ہے۔"

"ہوں، میں صدر مملکت سے اس سلسلے میں بات کروں گا اور اس کا اجازت نامہ منسوخ کراؤں گا۔ صرف آج کا واقعہ ہی بتانے کی دیر ہو گی۔"

"آپ مختار ہیں — جو جی چاہے کر سکتے ہیں۔" ڈی آئی جی صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آخر آپ کی انسپکٹر جمشید سے کیا دشمنی ہے؟" پروفیسر داؤد نے پہلی مرتبہ اس بات چیت میں دخل دیا۔

"دشمنی، بھلا مجھے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بس میں کوئی غیر قانونی کام ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"آپ بے فکر رہیں — انسپکٹر جمشید اور اس کے بچوں کی میں ذمے داری لیتا ہوں — وقتی طور پر اگر وہ کوئی غیر قانونی حرکت کرتے بھی ہیں تو بہت ہی مجبور ہو کر — جب یہ دیکھتے ہیں کہ کام اٹک رہا ہے اور اٹکنے کی صورت میں ملک اور قوم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے تو وہ قانون کی معمولی سی حد پھلانگ جاتے ہیں — بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرتے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"آپ کو کیا معلوم؟" سر داؤد نے پوچھا۔

"میرے اس سے اور اس کے بچوں سے قریبی تعلقات ہیں۔ ہم آپس میں گہرے دوست ہیں اور یہی نہیں، خان رحمان بھی ان کے دوست ہیں۔" پروفیسر داؤد نے بتایا اور خان رحمان مسکرانے لگے۔

"آپ جیسے لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں، اسی لیے اس کا دماغ آسمان پر چڑھا رہتا ہے۔" ملک عطا خان بولے۔

"ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں — وہ تو بہت سادہ مزاج آدمی ہے۔ دراصل آپ اس سے واقف نہیں ہیں — آپ نے کبھی اسے قریب سے نہیں دیکھا۔" خان رحمان نے ہنس کر کہا۔

"میرا خیال ہے، آپ لوگ بے کار کی بحث میں الجھ گئے ہیں۔ مجھے معاف فرمائیے گا، ذرا میں ایک فون کروں گا۔" ایک افسر نے دخل دیتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

یہ سردار ابراہیم تھے۔ ان کے خیال دلانے پر سب نے محسوس کیا کہ واقعی وہ ایک بے کار سی بحث میں الجھ گئے تھے۔

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" خان رحمان نے سردار ابراہیم سے کہا، وہ اس وقت تک چند قدم چل چکے تھے، رک کر بولے:

"میں ابھی فون کر کے آتا ہوں — مجھے امید ہے کہ اس وقت تک آپ کوئی اور بات چھیڑ چکے ہوں گے۔"

یہ کہتے وقت وہ مسکرائے اور ٹیلی فونوں والے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"آدمی عقل مند معلوم ہوتا ہے — مجلس میں پہلی بار بولا اور سب کو

احساس دلادیا کہ ہم معزز شہری ہوتے ہوئے ایک غلط بحث میں الجھ گئے تھے۔"
پروفیسر داؤدان کے جانے کے بعد بولے۔

"جی ہاں، بہت عقل مند ہے ۔۔۔ شہر میں اس کی چار کوٹھیاں ہیں۔ اس سے حساب لیا جائے کہ اس نے یہ عالی شان کوٹھیاں کس طرح بنوائی ہیں تو پتا چلے کہ کتنا عقل مند ہے۔" سرداؤد نے جل کر کہا۔

"خیر چھوڑیں، ہمیں اس سے کیا بحث ۔۔۔ جن لوگوں نے ناجائز ذریعوں سے دولت کما رکھی ہے، ان کے خلاف تحقیقات شروع ہو گئی ہے۔"

"آٹھ بج کر پچیس منٹ ہو چکے ہیں۔ مہمان کے آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔" ڈی آئی جی صاحب نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت انسپکٹر جمشید کے بلائے ہوئے ماہرین اندر داخل ہوئے۔ ان میں فوٹو گرافر بھی تھے اور انگلیوں کے نشانات ابھارنے والے بھی ۔۔۔ انہوں نے بھی اُن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہمیں انسپکٹر جمشید نے طلب کیا ہے ۔۔۔ وہ ہمیں کہاں ملیں گے؟"

"اندر۔"

ڈی آئی جی صاحب نے مختصر جواب دیا اور آگے بڑھ گئے۔

"اس سے پہلے بھی ایک آدمی اندر جا چکا ہے اور اب چار پانچ آدمیوں کی ٹولی یہ گئی ہے ۔۔۔ اگر ان لوگوں میں کوئی غلط آدمی شامل ہو گیا تو؟" ملک عطا خان نے پوچھا۔

"انسپکٹر فیروز دروازے پر موجود ہے۔ وہ اندر آنے والوں کی تلاشی لینے اور ان کے کاغذات دیکھنے کے بعد ہی اندر آنے دیتا ہے اور پھر یہ جتنے آدمی آئے ہیں، ہمارے اپنے محکمے کے ہیں، میں بھی انہیں پہچانتا ہوں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

شہر کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی ۔۔۔ یہ صرف وہ لوگ تھے جنہیں کارڈ جاری کیے گئے تھے ۔۔۔ آج کے دن کارڈ کے بغیر نیشنل ہال میں داخلہ ممکن نہیں تھا ۔۔۔ اچانک ایک آدمی پگڑی باندھے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے تین آدمی اور تھے۔

ڈی آئی جی صاحب کو پگڑی والا یہ آدمی کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ وہ الجھن کا شکار ہو گئے اور سوچنے لگے ۔۔۔ آخر یہ کون ہے ۔۔۔ انہوں نے اسے کہاں دیکھا ہے ۔۔۔ جوں جوں وہ اس کی طرف دیکھتے گئے، ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔

پگڑی والا اپنے پیچھے آنے والوں کے ساتھ کرسی پر بیٹھ چکا تھا ۔۔۔ دوسری طرف آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان یہ سوچ سوچ کر بھی پریشان ہو رہے تھے کہ نہ جانے انسپکٹر جمشید اور اس کے ساتھی بم تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔

دفعتہً ڈی آئی جی صاحب چونک اٹھے۔ پگڑی والا ٹہلنے کے انداز میں اٹھا تھا ۔۔۔ لیکن اس کے قدم اندر جانے والے راستے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ بے چین ہو گئے ۔۔۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ سرداؤد اور ملک عطا خان

بھی اس پگڑی والے کو گھور رہے تھے ـــ اس وقت اندر سے سردار ابراہیم آتا دکھائی دیا ـــ پگڑی والا ان کے پاس سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا۔

اس وقت ڈی آئی جی صاحب نے سوچا، کیا پگڑی والا کسی کو فون کرنے اندر گیا ہے ـــ

٭ ٭ ٭

سٹین گن کو دیکھ کر ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دلاور انہیں دھوکا دے گا۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ان کا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا ہے۔

"تم اب پھانسی سے نہیں بچ سکو گے۔" انسپکٹر جمشید نے مضبوط لہجے میں کہا ـــ

"تم اپنی پھرتی کی وجہ سے پستول کی گولی سے تو بچ جاتے ہو لیکن سٹین گن سے نکلنے والی گولیوں سے کس طرح بچو گے۔" دلاور نے ہنس کر کہا۔

"اللہ بچانے والا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے:

"ویسے کیا اس سٹین گن پر بھی سائلنسر لگا ہوا ہے اور اس میں سے بھی آواز نہیں نکلے گی۔"

انہوں نے پوچھا ـــ شاید وہ وقت گزار رہے تھے۔

"ہاں، یہ بھی بے آواز ہے، تم بھسم ہو جاؤ گے ـــ" اس نے غرا کر کہا۔

"لیکن تم ہماری لاشوں کا کیا کرو گے ـــ ساڑھے آٹھ بجنے میں صرف دو منٹ باقی ہیں۔"

"ہمارے پاس ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں اور پھر اس ہال میں کون آئے گا۔ مہمان تو ہمارے سروں پر موجود ہوں گے ـــ بم تمہارے خیال کے مطابق اس فانوس میں ہی ہے" اس کے پھٹتے ہی ہال کی چھت کا نام و نشان غائب ہو جائے گا اور اوپر والا ہال بھی آدمیوں سمیت نیچے والے ہال میں سمٹ آئے گا۔ ملبے کے ایک ڈھیر کی صورت میں۔"

وہ کانپ کر رہ گئے ـــ یہ لمحے کس قدر خوفناک تھے۔ حالات ان کے قابو سے نکل کر ایک بار پھر دشمن کا ساتھ دے رہے تھے۔ دلاور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نچلے ہال کا رخ کون کر سکتا تھا ـــ سب لوگ تو مہمان کے پیچھے اوپر جانے والے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا ـــ دلاور پوری طرح ان کے والد کی طرف متوجہ تھا ـــ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے اور غیر محسوس طور پر اپنے ہاتھ جیبوں کی طرف جھکانے شروع کر دیے ـــ

"تمہارا منصوبہ واقعی بہت مکمل ہے ـــ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نیشنل ہال میں مجھے یہ حالات پیش آئیں گے ـــ ان حالات میں کیا تم میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کرو گے کہ اس کا نام بتا دو جو تمہارا سرغنہ ہے اور جس نے تمہیں اس کام پر مقرر کیا ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

"اگرچہ یہ تمہاری آخری خواہش ہے اور مرنے والے کی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے لیکن مجھے افسوس ہے، اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم پر ترس کھاتے ہوئے ضرور اس کا نام بتا دیتا۔"

"بہت خوب — میں سمجھ گیا، اسے تم پر اعتبار نہیں — اس لیے وہ تمہارے سامنے نہیں آتا۔"

"یہی سمجھ لو — اور یقین کر لو، مجھے اس کے خلاف بھڑکانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

"ارے نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی — وہ چونک اٹھے۔ دلاور بھی چونکا تھا — ساتھ ہی اس کی نظر محمود، فاروق اور فرزانہ پر پڑی۔ اس نے چلا کر کہا:

"خبردار، ہاتھ نیچے مت جھکاؤ۔"

ایک بار پھر ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے — دلاور نیچے اتر آیا۔ اس نے انہیں دروازے کے ساتھ دیوار سے لگ کر کھڑے ہونے کا حکم دیا — انہوں نے ایسا ہی کیا — سٹین گن کا رخ ان کی طرف رکھتے ہوئے اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی — اس طرح کہ اس کا صرف چہرہ دروازے سے نظر آ سکے۔ باہر سے کسی نے پوچھا:

"انسپکٹر جمشید تو یہاں نہیں ہیں؟"

"جی ہاں، یہیں ہیں — تشریف لے آئیے۔"

دلاور نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا — فوراً ہی انسپکٹر جمشید نے فوٹو گرافروں کو اندر آتے دیکھا — اندر داخل ہونے والوں نے جب انہیں اور ان کے ساتھیوں کو ہاتھ اوپر اٹھائے دیکھا تو چونک کر مڑے۔ اب ان کی نظریں سٹین گن پر پڑیں —

وہ دھک سے رہ گئے۔

"آپ لوگ بھی آ پھنسے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہمیں افسوس ہے جناب — ہم دیکھے بھالے بغیر اندر چلے آئے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کوئی بات نہیں — ایسا بھی ہوتا ہے۔" انہوں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

دلاور اب بھی ان سب کے مقابلے میں تنہا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی جس کی زد میں اس نے ان سب کو لیا ہوا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"کاش، میرا یہاں کوئی ساتھی ہوتا۔"

"کیوں، تمہیں ساتھی کی کیا ضرورت؟"

"وہ تم سب کو باندھ لیتا — اور پھر ہم اس ہال کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر یہاں سے چلے جاتے۔" دلاور نے مسکرا کر کہا۔

"تم بے وقوف ہو۔" اچانک فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"کیا کہا —" اس نے تلملا کر کہا۔

"میں نے کہا ہے کہ تم بے وقوف ہو۔" فاروق نے دوبارہ کہا۔

"بکو مت۔" وہ غرایا۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں — تم ہم میں سے کسی ایک کو باندھنے کے لیے کہہ سکتے ہو۔ ظاہر ہے کہ سٹین گن کی موجودگی میں ہم میں سے ہر ایک تمہارا حکم

ماننے پر مجبور ہے۔" فاروق نے اسے ترکیب بتائی۔ محمود اور فرزانہ اسے گھورنے لگے لیکن انسپکٹر جمشید کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اس مسکراہٹ کا مطلب یہ تھا کہ انہیں فاروق کی بات بہت پسند آئی ہے۔

"بہت خوب، تم بہت ذہین ہو ــ مجھے یہی کرنا چاہیے ــــ انسپکٹر جمشید، تمہارے بیٹے نے جو ترکیب بتائی ہے، اس پر عمل کرو ــ اپنے تمام ساتھیوں کو کس کر باندھ دو۔"

"لیکن باندھوں کس سے، کیا ہوا سے باندھوں۔" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"فکر نہ کرو، میں تمہیں رسی دوں گا ــ اس قسم کی چیزیں ہم جیسے لوگ اپنے پاس ضرور رکھتے ہیں۔ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے۔"

دلاور نے کہا اور اپنی پتلون کی جیب سے ریشم کی ڈوری نکال کر انسپکٹر جمشید کی طرف اچھال دی۔

ہاتھ کھل گئے

پگڑی والے نے اندر آکر ہال کے اردگرد ایک چکر لگایا۔ اسے تمام دروازے کھڑکیاں بند نظر آئیں ــــ وہ پریشان ہوگیا ــ اس نے جلدی سے ٹیلی فونوں والے کمرے میں جھانکا ــــ وہاں نگران موجود تھا۔ پگڑی والا اندر داخل ہوگیا اور ایک فون کا ریسور اٹھا کر نمبر گھمانے لگا ــــ جلد ہی دوسری طرف سے جواب دیا گیا:

"ہیلو۔"

"کون؟" پگڑی والے نے کہا۔

"چوکیدار ــــ" آواز آئی۔

"تم اندر کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"پگڑی والا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اوہ، یہاں ایک مصیبت نازل ہوگئی تھی ــــ لیکن میں نے حالات سنبھال لیے ہیں ــــ اگر آپ بھی یہاں آجائیں تو آسانی رہے گی ــــ کیوں کہ میں سارے آدمیوں کو نشانے پر لیے کھڑا ہوں۔"

"کیا؟" پگڑی والے نے کہا۔

"جی ہاں، خاص بات یہ کہ ان میں انسپکٹر جمشید بھی موجود ہے۔"

"اوہ، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے ــــ میں آ رہا ہوں۔" اس نے کہا اور جلدی سے فون رکھ کر باہر نکل آیا ــــ اب اس کا رُخ پھر ہال کے دروازے کی طرف تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے تین بار انگلی سے دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا ــــ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

"اوہ، یہاں تو لمبا چوڑا شکار موجود ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"جی ہاں ــــ میں پریشان تھا کہ انہیں کس طرح باندھوں۔ پھر انسپکٹر جمشید کے لڑکے نے خود ہی میری مشکل حل کر دی ــــ اس نے ترکیب بتائی کہ میں کام ان میں سے کسی سے بھی لے سکتا ہوں۔ انسپکٹر جمشید اس وقت تک اپنے تین ساتھیوں کو باندھ چکے ہیں۔"

"بہت خوب، مزہ آ گیا۔" پگڑی والے نے کہا اور انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھا۔

"تو یہ تم ہو۔" انسپکٹر جمشید نے اسے گھور کر کہا۔

"تو تم نے مجھے پہچان لیا؟" پگڑی والے نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں نہ پہچانوں گا ــــ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو سڑک پر ملاقات ہوئی تھی اور پھر یہ پگڑی تمہیں کم از کم میری نظروں سے نہیں بچا سکتی ــــ اکرام، اس سے ملو۔"

"کیا؟" اکرام حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں، بے چارہ کٹے ہوئے کان کو پگڑی سے چھپا کر آیا ہے۔"

"بکواس ــــ" شرفو نے چلا کر کہا ــــ یہی نہیں، اس نے زناٹے دار تھپڑ

انسپکٹر جمشید کے گال پر جڑ دیا ــــ یہ تھپڑ اس قدر اچانک اور امید کے خلاف تھا کہ انسپکٹر جمشید بچ نہ سکے ــــ ان کا منہ گھوم گیا ــــ بس پھر کیا تھا۔ انہوں نے دیکھا، انسپکٹر جمشید کا چہرہ سرخ ہو گیا ــــ انہیں یوں لگا جیسے اسے خون میں ڈبو دیا گیا ہو ــــ اُن کا جسم جوش کی زیادتی سے کانپنے لگا ــــ آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں ــــ وہ سب یہ دیکھ کر چونک گئے ــــ پگڑی والا بھی سہم گیا ــــ نہ جانے اُسے انسپکٹر جمشید کی آنکھوں اور چہرے میں کیا بات نظر آئی تھی کہ تھر تھر کانپنے لگا ــــ محمود، فاروق اور فرزانہ نے اپنے والد کا یہ روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُف خدا، وہ کتنے بھیانک لگ رہے تھے۔ وہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہے تھے ــــ پھر اچانک وہ ایک قدم پگڑی والے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے تھر تھر کانپتے ہوئے اس کے جسم کو دونوں ہاتھوں میں اس طرح اٹھا لیا۔ جیسے کوئی بچہ گڑیا کو اُٹھا لیتا ہے ــــ اسے ہاتھوں میں اٹھا کر انہوں نے اپنے سر سے اوپر کر لیا اور چکر کاٹنے لگے ــــ یوں لگ رہا تھا جیسے انسپکٹر جمشید اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہوں، جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔

"مجھے تھپڑ مار کر آج تک کوئی شخص زندہ نہیں بچا۔"

انہوں نے خوفناک لہجے میں کہا ــــ محمود، فاروق اور فرزانہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آواز کتنی عجیب اور انجانی لگی تھی۔ یہ آواز ان کے والد کی تو نہیں تھی۔

انسپکٹر جمشید ابھی تک تیزی سے چکر کاٹ رہے تھے ــــ پگڑی والا ان کے ہاتھوں میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ڈری ڈری چیخیں نکل

رہی تھیں — چوکیدار سکتے کے عالم میں کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا — پھر جیسے
ہوش میں آ گیا۔

"نہیں نہیں، اسے چھوڑ دو — اسے چھوڑ دو، ورنہ میں گولی چلا
گا۔" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر پوری قوت سے پگڑی
کو اس کی طرف اس طرح اچھال دیا جیسے وہ کوئی گیند تھا — پگڑی والا تیر کی
فضا میں تیرتا ہوا چوکیدار کی طرف گیا — چوکیدار خوفزدہ ہو گیا — وہ ایک
فرش پر بیٹھ گیا — پگڑی والا سر کے بل دیوار سے ٹکرایا — اس کے حلق
ایک آخری دلخراش چیخ نکلی۔ اکرام اور دوسرے لوگ تھرا اُٹھے۔

اس کا سر پھٹ کر چور چور ہو گیا تھا — چند سیکنڈ کے لیے وہ تڑپا اور
ٹھنڈا ہو گیا — عین اسی وقت باہر سے فوجی بینڈ کی آواز ہال میں آئی — مہما
عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔

* * *

ان سب پر سکتہ طاری تھا۔ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ یوں
بنے کھڑے تھے جیسے کسی جادوئی دیس میں پیچھے مڑ کر دیکھ لینے کی وجہ سے پتھر
بن گئے ہوں — پگڑی والے کے پھٹے ہوئے سر سے خون بہہ بہہ کر فرش پر پھیل
رہا تھا — آخر انسپکٹر جمشید کی آواز ہال میں گونجی:

"یہ تھا ملک کے ایک غدار کا انجام — اگر یہ مجھے تھپڑ نہ مارتا تو عد
سے اسے سزا ہوتی، لیکن اس کا وقت پورا ہو چکا تھا — اس نے اپنی موت کو آوا

دی تھی اور اب تم بھی سن لو مسٹر چوکیدار، تم بھی ملک کے غدار ہو — تم بھی نہیں
بچ سکو گے۔ پھانسی کا تختہ تمہارا مقدر بن چکا ہے۔"

"سٹین گن ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے اور تم لوگوں سے کافی فاصلے
پر کھڑا ہوں — میں تم سب کو بھون ڈالوں گا۔"

"بھون ڈالو — لیکن تم بچ نہیں سکو گے — نو بجنے میں اب بہت تھوڑا
وقت رہ گیا ہے — تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ سٹین گن پھینک کر خود کو ہمارے
حوالے کر دو اور وعدہ معاف گواہ بن جاؤ — اس طرح تم بچ جاؤ گے۔" انسپکٹر
جمشید نے کہا۔

"اس خیال کو دل سے نکال دو — یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تم اپنا کام وہیں
سے شروع کر دو جہاں چھوڑا تھا — میرا مطلب ہے، اپنے ساتھیوں کو باندھنا
شروع کر دو۔"

"بہت اچھا — اگر تم یہی چاہتے ہو تو سن لو — تم اپنی بدقسمتی کو آواز
دے رہے ہو — یہ ملک زندہ رہے گا، تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے —
تمہاری یہ سازش دھری کی دھری رہ جائے گی، کیونکہ اس ملک میں خدا کے نام
لیوا بستے ہیں — یہ ملک خدا کے منکروں کا نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے
گئے۔

"اپنا کام کرو، میں انتظار ہرگز نہیں کروں گا۔" اس نے غرا کر کہا۔

"بہت اچھا۔"

انہوں نے کہا، اور اپنے باقی ساتھیوں کے ہاتھ کمر پر باندھنے لگے۔

ان کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا ــــ وقت بھی تیزی سے گزر رہا تھا ــــ انہیں جو کچھ کرنا تھا، نو بجے سے پہلے کرنا تھا ــــ ہاتھ باندھتے وقت وہ ایک خاص طریقہ اختیار کر رہے تھے ــــ اس طریقے سے ان کے علاوہ اکرام، محمود، فاروق اور فرزانہ بھی واقف تھے ــــ ایک معمولی سی کوشش رسی کے بلوں کو کھول سکتی تھی لیکن دوسرا آدمی دیکھنے پر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ہاتھ کسی خاص طریقے سے بندھے ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی وہ پریشان تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر سب کے باندھے جانے کے بعد چوکیدار نے ان کے ہاتھ بھی باندھ دیے اور اس کے بعد بھی وہ سٹین گن لیے ہال میں کھڑا رہا تو کیا ہوگا ــــ ہو سکتا ہے کہ وہ نو بجے سے صرف چند منٹ پہلے ہال میں انہیں بند کر کے چلا جائے اس صورت میں خطرہ بہت زیادہ تھا ــــ اس لیے انہوں نے سوچا ــــ جو کچھ کرنا ہے، نو بجنے سے بہت پہلے کر لینا چاہیے۔ انہوں نے اپنے کام کی رفتار تیز کر دی۔ یہاں تک کہ سب کے ہاتھ باندھ دیے۔

"بہت خوب، اب صرف تم بچ گئے ہو ــــ تمہارے ہاتھ میں خود باندھوں گا۔ کاش، یہ جلدی نہ کرتا تو اس وقت میری بہت مدد کرتا۔" چوکیدار نے شرلو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم سب لوگ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ ــــ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم سب کے ہاتھ کس کر باندھے گئے ہیں یا نہیں اور تم انسپکٹر جمشید ــــ تم الگ ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ ــــ یاد رکھو، میری سٹین گن کا رخ تمہاری طرف رہے گا ــــ ادھر تم نے حرکت کی ادھر تم ڈھیر ہوئے۔"

"بہت اچھا۔"

وہ سب دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے ــــ انسپکٹر جمشید الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ چوکیدار اپنا اطمینان کر لے۔ اس نے سب کے ہاتھوں کو ہلا جلا کر دیکھا اور آخر اپنی جگہ واپس آ کر کہنے لگا:

بہت خوب، ہاتھ تو تم نے خوب کس کے باندھے ہیں ــــ یوں لگتا ہے جیسے تم نے اپنے دوستوں کے نہیں، دشمنوں کے ہاتھ باندھے ہیں۔" یہ کہتے وقت وہ مسکرایا بھی، پھر بولا:

"اور اب میں تمہارے ہاتھ باندھوں گا۔"

"ضرور، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"اب تم بھی اپنا منہ دیوار کی طرف کر لو اور دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے لا کر ملا لو۔"

"بہت بہتر۔"

"انہوں نے ایسا ہی کیا اور خاموشی سے ہاتھ بندھوا لیے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ چوکیدار جلد از جلد ہاتھ باندھ کر یہاں سے چلا جائے۔

"میں حیران ہوں، کیا واقعی تم انسپکٹر جمشید ہو۔" اس نے الگ ہٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں، تمہیں کوئی شک ہے؟"

"ہاں، میں نے تو انسپکٹر جمشید کی بہت شہرت سن رکھی ہے۔ سنا ہے، اس نے بڑے بڑے مجرموں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے ــــ اگر تم انسپکٹر جمشید ہی ہو تو اتنی آسانی سے کیسے پھنس گئے۔"

"اب سٹین گن کے سامنے بے چارہ انسپکٹر جمشید کر بھی کیا سکتا ہے۔" انہوں نے بے چارگی کے انداز میں کہا۔

"کیا اب ہم اپنے منہ تمہاری طرف کر لیں؟" فرزانہ نے پرسکون آواز میں پوچھا۔

"بالکل، لیکن تم کھڑے دیوار سے لگ کر ہی رہو گے۔"

انہوں نے اپنے رُخ تبدیل کر لیے — اب ان کے ہاتھ دیوار کی طرف تھے اور چوکیدار ان ہاتھوں کو حرکت کرتے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"اب سنو۔" اس نے ہنس کر کہا:

"میں اس ہال سے نو بجنے میں صرف دو منٹ پر جاؤں گا تاکہ دو منٹ کے اندر تم کچھ نہ کر سکو۔"

"ہوں، تم بہت چالاک ہو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور اس کا سینہ غرور سے تن گیا۔

"ابا جان، آپ لوگ بہت دیر سے باتیں کر رہے ہیں۔ اب چند باتیں ہمیں بھی کرنے کی اجازت دیں۔" اچانک محمود نے کہا۔

"نہیں بھئی، چوکیدار صاحب بُرا مان جائیں گے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، ان سے پوچھ لو۔" انسپکٹر جمشید نے چوکیدار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیوں نہیں، یہ تمہاری زندگی کے آخری لمحات ہیں — تمہیں جو کہنا ہے ضرور کہو۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر اس آدمی کا نام بتا دو جو اس سازش کے پیچھے ہے۔" فرزانہ بولی۔

"میں کہہ چکا ہوں، میں اس کا نام نہیں جانتا، نہ ہی اس کی کبھی شکل دیکھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا، اتنا بتا دو — وہ رہتا کہاں ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔"

"اتنا بتا دو کہ تمہیں کس جگہ ملا کرتا ہے۔"

"میں تمہیں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن ہم تو چند گھڑیوں کے مہمان ہیں — تمہیں ہم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"تم سے کوئی خطرہ نہیں — دراصل وہ مجھ سے خود ہی مل لیتا ہے — کسی پبلک مقام پر یا کسی گلی میں ملاقات کا پیغام بھیج دیتا ہے۔"

"پیغام ڈاک کے ذریعے بھیجتا ہے یا دستی؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"کبھی ڈاک کے ذریعے — کبھی کسی راہگیر کے ذریعے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم ہمیں کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔" فاروق بولا۔

"جو مجھے معلوم ہے بتا تو رہا ہوں۔"

"اگر تمہاری معلومات کا یہی عالم ہے تو پھر تو خدا ہی حافظ ہے۔ وہ تمہیں بیچ مصیبت میں چھوڑ کر الگ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہو جائے، میں تو صرف ایک لاکھ روپے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا بھائی کرلو — حاصل —" فاروق نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا اور سب مسکرانے لگے۔

پھر اچانک محمود نے کہا:

"تم اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے ہو — میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

"بکو۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"جو آدمی اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتا ہے، وہ مار کھا جاتا ہے اور اس وقت تم بھی مار کھا چکے ہو۔"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ — یہ دیکھو۔"

یہ کہہ کر محمود نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے۔

چوکیدار کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ابھی چند منٹ پہلے اس نے سب کے ہاتھ خود چیک کیے تھے۔

"نہ صرف یہ کہ میرے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں بلکہ میں ان سے ٹافی بھی کھا سکتا ہوں — یہ دیکھو — میرے دائیں ہاتھ میں ایک ٹافی بھی موجود ہے اور اب میں اسے کھانے چلا ہوں۔"

یہ کہہ کر محمود ٹافی کا کاغذ اتارنے لگا۔

"بُری بات ہے محمود — چوکیدار کے بغیر تم ٹافی کھاتے اچھے نہیں لگو گے۔"

فاروق نے کہا۔

"اچھی بات ہے — تو یہ ٹافی میں اسے پیش کر دیتا ہوں۔"

محمود نے کہا اور کاغذ اترتے ہی ٹافی چوکیدار کی طرف اچھال دی۔

بم مل گیا

نو بجنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے لیکن انسپکٹر جمشید یا ان کے کسی ساتھی نے ابھی تک آکر کوئی خبر نہیں دی تھی — آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان بہت پریشان تھے۔ ان کا تو خیال تھا کہ انسپکٹر جمشید بہت جلد بم تلاش کر کے انہیں خوش خبری سنائیں گے — اس وقت تک مہمان وزیر اعظم اور دوسرے حضرات ہلکے پھلکے مشروبات پی چکے تھے اور اب کھانے کے ہال میں آکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے —

پروگرام یہ تھا کہ مہمان کھانے سے پہلے ایک تقریر بھی کریں گے۔ لوگ بے چینی سے ان کے اٹھنے اور تقریر شروع کرنے کا انتظار کر رہے تھے، لیکن شیخ صاحب اور خان صاحب انسپکٹر جمشید کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہال میں یہ بات ان دونوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھی کہ ہال میں موجود تمام لوگوں کے سروں پر موت کھیل رہی ہے — آخر شیخ صاحب نے جھک کر خان صاحب کے کان میں کہا:

"اب کیا کریں؟"

"جمشید سے ایسی امید تو نہیں کہ وہ ناکام رہا ہو۔" خان صاحب نے جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے — خدا جانے کیوں وہ اب تک نہیں آیا۔ اب اگر دس منٹ تک بھی وہ یہاں نہ پہنچا تو ہمیں صدرِ مملکت کو اصل حالات سے آگاہ کرنا پڑے گا، تاکہ مہمان اور سب لوگوں کی جانیں بچائی جا سکیں — ذرا سوچیے، یہ ہمارے لیے کس قدر بے عزتی کی بات ہو گی — دنیا بھر کے اخبارات اس خبر کو اچھالیں گے کہ مہمان وزیر اعظم کھانا نہ کھا سکے۔" شیخ صاحب کہتے چلے گئے۔

"ہوں، آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمارے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم یہاں سے جا نہیں سکتے۔"

"ہوں، کیوں نہ خان رحمان کو انسپکٹر جمشید کی تلاش میں بھیجا جائے۔ وہ اس کے دوست بھی ہیں۔" شیخ صاحب نے تجویز پیش کی۔

"تجویز تو معقول ہے، مگر میں سوچتا ہوں، انسپکٹر جمشید کو بھی تو یہ بات معلوم ہے کہ بم نو بجے پھٹے گا اور یہ کہ اگر کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو پھر مہمان کو باخبر کرنا ہی پڑے گا۔" خان صاحب نے جواب دیا۔

"ہاں، لیکن جن لوگوں نے بم چھپایا ہے، انہوں نے اس کی حفاظت کا بھی تو کوئی بندوبست کیا ہو گا — کیا خبر، انسپکٹر جمشید اور اس کے بچے کسی مصیبت میں پھنس گئے ہوں۔" شیخ صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

"اوہ، اس طرف تو میرا خیال ہی نہیں گیا — خدا کی قسم، یہ بات بھی ہو سکتی ہے اور ہمیں فوراً کچھ کرنا چاہیے۔"

"اس وقت تو ہم خان رحمان کو ہی بھیج سکتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں اُن سے بات کرتا ہوں۔"

خان صاحب بولے۔ خان رحمان ان کے دائیں طرف بیٹھے تھے۔ اب وہ ان کی طرف جھکے اور کان میں بولے:

"خان رحمان، ہم سب خطرے میں ہیں۔"

"کیا مطلب؟" خان رحمان نے دھیمے لہجے میں کہا — انھوں نے بڑی مشکل سے خود کو چونکنے سے بچایا تھا۔

"محمود، فاروق اور فرزانہ جو اہم اطلاع لے کر آئے تھے، وہ یہ تھی کہ اس عمارت میں ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے جو نو بجے پھٹے گا — یہ شیخ صاحب نے اور میں نے انسپکٹر جمشید کو یہ کام سونپ دیا تھا کہ وہ عمارت میں سے بم کو ڈھونڈ نکالیں، وہ بچوں کو لے کر چلے گئے تھے — ان کے بعد اکرام اور فوٹو گرافر بھی اندر گئے تھے لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کسی کامیابی کی اطلاع نہیں ملی۔"

"ارے باپ رے — اور آپ لوگ آرام سے بیٹھے ہیں — ہمیں بتایا تک نہیں۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا — آواز ان کی اب بھی نیچی ہی تھی۔

"بتایا اس لیے نہیں کہ خیال یہ تھا، انسپکٹر جمشید بہت جلد بم کو ڈھونڈ لیں گے، کیونکہ وہ اور ان کے بچے اس کام میں بہت ماہر ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، انھوں نے ڈھونڈ بھی لیا ہو، لیکن دشمن بھی تو بم کی نگرانی کر رہے ہوں گے — ظاہر ہے جو لوگ نیشنل ہال میں بم چھپا سکتے ہیں، وہ اپنے کچھ آدمی مہمانوں میں شامل کر کے اندر بھی لا سکتے ہیں اور بم کی نگرانی پر مقرر کر سکتے ہیں۔"

"میرا اور شیخ صاحب کا بھی یہی خیال ہے، بلکہ یہ خیال ابھی ابھی آیا ہے۔" خان صاحب بولے۔

"اور بہت دیر سے آیا ہے۔" خان رحمان نے ایک دم کہا۔

"ہاں، اب مشکل یہ ہے کہ ہم اپنی جگہوں سے نہیں اٹھ سکتے۔ اس لیے آپ ذرا نیچے جائیں اور انھیں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوں۔"

"اچھی بات ہے، لیکن ابھی اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہماری کوشش یہی ہے۔" خان صاحب بولے۔

"تو ٹھیک ہے — میں جا رہا ہوں۔"

خان رحمان نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

٭ ٭ ٭

چوکیدار نے اپنی طرف آنے والی ٹافی کی طرف کوئی دھیان نہ دیا — اس نے اسے بچوں کی شرارت سمجھا اور بولا:

"میں حیران ہوں...."

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے — اسی وقت ایک زور دار دھماکا ہوا — چوکیدار کے ہاتھ سے سٹین گن چھوٹ کر فضا میں اچھلی اور ہال کے بیچوں بیچ فرش پر آ رہی۔ فوٹو گرافر یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ چوکیدار بے ہوش پڑا تھا۔

"بہت خوب محمود، تم نے کمال کر دیا ۔۔۔ لیکن باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں فوراً بم کو بے کار کر کے اوپر پہنچنا چاہیے ۔۔۔ کیونکہ اصل مجرم کو پکڑنے کا اس سے اچھا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اصل مجرم ۔۔۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا:

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اصل مجرم بھی اوپر تقریب میں شامل ہے۔"

"بالکل، اسے تو میں بہت پہلے پہچان چکا ہوں ۔۔۔ لیکن اصل مسئلہ تو بم کو تلاش کرنا تھا۔"

"لیکن ابا جان، وہ اوپر کیسے ہو سکتا ہے ۔۔۔ کیا اسے اپنی زندگی پیاری نہیں ۔۔۔"

"پیاری کیوں نہیں، وہ نو بجے سے کچھ پہلے ہی نکل جائے گا ۔۔۔ کوئی بہانا کر کے ۔۔۔ جس طرح یہ چوکیدار کہہ رہا تھا کہ نو بجنے میں چند منٹ رہ جائیں گے تو یہاں سے چلا جائے گا۔"

"اوہ ۔۔۔" ان کے منہ سے نکلا ۔۔۔

"توبہ ۔۔۔ کس قدر خوفناک لمحات تھے یہ ۔۔۔" ایک فوٹو گرافر بولا۔

اس دوران میں انسپکٹر جمشید میز پر چڑھ کر فانوس میں رکھا ہوا بم نکال چکے تھے۔ اسے بے کار کرتے میں انہوں نے صرف چند سیکنڈ لگائے۔

"آپ سب لوگ اس ہال کی اور لاش کی تصویریں لے لیں اور اس چوکیدار کو باندھ کر ڈال دیں۔ یہ ایک اہم گواہ ثابت ہوگا ۔۔۔ اکرام، تم اپنی نگرانی میں یہ کام کراؤ گے۔ میں اوپر والے ہال میں جا کر شیخ صاحب اور خان صاحب کو

خوشخبری سناتا ہوں۔"

"جی بہت اچھا۔" اکرام بولا۔

"آؤ بچو۔" انہوں نے تینوں سے کہا۔

وہ انہیں لے کر ہال میں عین اس وقت پہنچے جب خان رحمان اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مسکرائے اور پلٹتے ہوئے خان صاحب سے بولے:

"لیجیے، وہ آ گئے ۔۔۔ آخر یہ انسپکٹر جمشید ہے۔ کوئی کام اس کے ذمے لگائیں اور یہ اسے پورا کر کے نہ چھوڑے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے، جمشید کامیاب لوٹا ہے۔" خان صاحب بولے۔

"خیال ہی نہیں، یقین بھی ہے۔" شیخ صاحب مسکرائے۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید نزدیک آ گئے ۔۔۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ان کے پیچھے تھے۔ آتے ہی انہوں نے شیخ صاحب اور خان صاحب کی طرف جھکتے ہوئے دبی زبان میں کہا:

"بے فکر ہو کر بیٹھیں ۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے اور محمود، فاروق اور فرزانہ سے بولے:

"تم تینوں بھی یہیں ٹھہرو، پورے ہال پر نظر رکھو۔"

انہوں نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہال سے باہر نکل گئے۔

تقریر کی چھاؤں میں

مہمان وزیرِ اعظم کی تقریر شروع ہو چکی تھی - وہ دونوں ملکوں کے دوستانہ تعلقات پر روشنی ڈال رہے تھے اور خیال ظاہر کر رہے تھے کہ یہ تعلقات روز بروز مضبوط ہوتے چلے جائیں گے اور اس طرح دونوں ملکوں کے زبردست دشمن کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوگی -

اس دوران میں شیخ صاحب محمود، فاروق اور فرزانہ کے لیے کرسیوں کا انتظام کر چکے تھے - شیخ صاحب نے بے چین ہو کر کہا -

"بھئی، کچھ تم لوگ ہی بتاؤ — بم کا کیا بنا ؟"

"جی، بم ہم تلاش کر چکے ہیں — ابا جان نے اسے بے کار کر دیا ہے" محمود نے سرگوشی کی -

"لیکن تم لوگوں کو اتنی دیر کیوں لگی ؟"

"دشمن نے پوری تیاری کر رکھی تھی — نچلے ہال میں ایک لاش اور ایک بے ہوش دشمن موجود ہے — اس دشمن نے ہال کے چوکیدار کی جگہ لے رکھی تھی - اصل چوکیدار کو ان لوگوں نے غائب کر دیا ہے "

"اوہ " وہ دھک سے رہ گئے -

محمود، فاروق اور فرزانہ انہیں تفصیل سے سب کچھ بتانے لگے - ان کی

آنکھیں حیرت اور خوف کی زیادتی سے پھیل گئیں — وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نیشنل ہال میں اس قدر زبردست سازش بھی ہو سکتی ہے. جب کہ یہاں نگرانی کے لیے ایک انسپکٹر اور اس کے ماتحت پچاس کے قریب کانسٹیبل بھی موجود تھے — انہوں نے سوچا، کیا انسپکٹر فیروز دشمنوں سے مل گیا ہے — آخر میں جب محمود نے انہیں یہ بتایا کہ ان کے والد نے یہ بھی کہا ہے کہ اصل مجرم ہال میں موجود تو وہ دنگ رہ گئے اور سوچنے لگے، آخر وہ کون ہو سکتا ہے - ان کی الجھن میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا -

دوسری طرف محمود، فاروق اور فرزانہ اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے تھے - ان کی آوازیں سرگوشیوں سے زیادہ بلند نہیں تھیں -

"آخر وہ کون ہے جس نے یہ سارا منصوبہ بنایا ہے" محمود کہہ رہا تھا -

"ابا جان کا خیال ہے کہ وہ ہال میں موجود ہے" فاروق مسکرایا -

"یہ تو ہمیں بھی معلوم ہے کوئی نئی بات بتاؤ" فرزانہ نے جل کر کہا -

"کوئی نئی بات اسے معلوم ہو تو بتائے بھی" محمود بولا -

"جی ہاں، نئی باتیں تو سب کی سب محمود نے دبا لی ہیں" فاروق نے جواب دیا -

"میرا خیال ہے، مجرم انسپکٹر فیروز کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا" آخر فرزانہ نے اپنا خیال پیش کر دیا -

"تمہارا خیال اس تک کیسے پہنچا "

"اس لیے کہ اس پوری عمارت کی نگرانی اس کے ذمے ہے - آخر یہ

کیسے ممکن ہے کہ نیشنل ہال میں بم بھی پہنچ جائے ۔۔۔ سٹین گن اور پستول بھی پہنچ جائے ۔۔۔ چوکیدار کی جگہ نقلی چوکیدار لے لے اور اس پر بھی انسپکٹر فیروز کو کانوں کان خبر نہ ہو ۔۔۔ اگر وہ کسی کو اندر جانے سے روکے بھی تو ہم جیسے بے ضرر بچوں کو ۔" فرزانہ نے اپنے خیال کی وجوہات بتائیں ۔

"تمہاری باتیں کافی وزن رکھتی ہیں ۔" محمود نے سنجیدہ لہجے میں کہا ۔

"تقریباً کتنا وزن رکھتی ہوں گی ۔" فاروق مسکرا اٹھا ۔

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے ۔" فرزانہ نے تیز لہجے میں کہا ۔

"تو پھر یہ باتیں کرنے کا بھی وقت نہیں ہے ۔ مہمان وزیراعظم کی تقریر ہو رہی ہے اور تم اپنی جاسوسی بگھار رہے ہو ۔" فاروق نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔

"ان کی تقریر تو ہم صبح اخبارات میں بھی پڑھ لیں گے ۔ اس وقت یہ سوچنا ضروری ہے کہ آخر اصل مجرم کون ہے ۔۔۔ کیونکہ کچھ ہی دیر بعد ابا جان اس راز پر سے پردہ اٹھانے والے ہیں ۔"

"اگر یہ سوچنا اتنا ہی ضروری ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں ۔۔۔ چلو بتاؤ کیا سوچوں ۔" اس نے شریر لہجے میں کہا ۔

"دھت تیرے کی ۔ کہہ تو رہا ہوں کہ یہ سوچو ، اصل مجرم ان میں سے کون ہو سکتا ہے ۔"

"اچھا چلو ، اس پر غور کر لیتے ہیں ۔۔۔ ہاں تو تم کہہ رہے تھے کہ فرزانہ کی باتیں کافی وزن رکھتی ہیں ۔۔۔ فی الحال چونکہ میں مذاق نہ کرنے کا وعدہ کر چکا

ہوں ، اس لیے یہ نہیں کہوں گا کہ اس کی باتیں وزن دار ہیں یا بے وزن ، کیوں کہ میرے خیال میں باتیں بے وزن ہوتی ہیں ۔۔۔ ہوا تو پھر بھی کچھ وزن رکھتی ہے ۔ لیکن باتیں بالکل کوئی وزن نہیں رکھتیں ، خیر چھوڑیے ۔۔۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ مجرم کون ہے ۔۔۔ فرزانہ کے خیال میں مجرم انسپکٹر فیروز ہے جب کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجرم ملک عطا خان ہے ۔۔۔ کیونکہ وہ بہت اثر رسوخ والا آدمی ہے ۔ ہر جگہ بغیر روک ٹوک کے آ جا سکتا ہے ۔ نیشنل ہال میں بھی آنے جانے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ساتھ ایک آدھ آدمی کیا کئی آدمی بھی اندر لا سکتا ہے ۔۔۔ آخر اس کے صدر مملکت سے گہرے تعلقات ہیں ۔ اور پھر یہی وہ آدمی ہے ، جس نے ابا جان کو اور ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا ۔ آخر ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ۔"

فاروق یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور جواب طلب نظروں سے محمود کی طرف دیکھنے لگا ۔

"بے شک شروع میں تم نے ادھر ادھر کی ہانکی ہے اور اپنی حرکت سے باز نہیں آئے ، پھر بھی بعد میں تم نے جو باتیں کہی ہیں ، وہ بھی بہت وزن رکھتی ہیں ۔" محمود نے مسکرا کر کہا ۔

"پھر وہی وزن ۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا ۔

"معلوم ہوتا ہے ، تم پر باتوں کو تولنے کا دورہ سا پڑ گیا ہے ۔ کچھ تم بھی تو کہو ، ہم بھی دیکھیں ، خود تمہاری باتیں کتنا وزن رکھتی ہیں ۔ رکھتی بھی ہیں یا بالکل بے وزن ہیں ۔" فرزانہ بولی ۔

"کیوں نہ ہم کسی دکان پر وزن کرنے پر ملازم ہو جائیں۔" فاروق جل کر بولا۔ ساتھ ساتھ وہ مہمانِ وزیرِ اعظم اور دوسروں پر بھی نظر ڈالتے جا رہے تھے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان کی تقریر کو بہت غور سے سن رہے ہیں، دراصل انھوں نے تقریر کا تو ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا — وہ تو اپنی ہی باتوں میں گم تھے — انسپکٹر جمشید بھی ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

"تم دونوں اپنا خیال ظاہر کر چکے۔ اب میں بتاتا ہوں — میرے خیال میں مجرم سرداؤد ہے — اس نے بھی ملک عطا خان کا ساتھ دیا تھا اور ہماری مخالفت کی تھی۔" محمود نے کہا۔

"تمہارا خیال بھی ٹھیک ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ ہم تین ہیں۔ تینوں تین مختلف آدمیوں کو مجرم سمجھتے ہیں، جب کہ میرے خیال میں مجرم ان میں سے ایک ہے۔ آخر وہ کون ہے؟" فاروق نے سوال اٹھایا۔

"اس سوال کا جواب ہمیں یہ معلوم کر کے مل سکتا ہے کہ کیا ان تینوں میں سے نیچے بیٹھنے کے دوران کوئی اٹھ کر اندر گیا تھا۔" محمود نے سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" فاروق اور فرزانہ چونکے۔

"ان میں سے جو بھی اندر گیا ہو گا، بس وہی مجرم ہے۔" محمود بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" فاروق بولا۔

"ظاہر ہے کہ جس کسی نے اندر بم رکھوایا ہے۔ اسے بے چینی بھی لگی ہو گی اور وہ اپنا اطمینان کرنے اندر ضرور گیا ہو گا۔ جب اس نے دیکھا ہو گا کہ پچھلے ہال میں حالات اس کے موافق ہیں تو چپ چاپ واپس چلا آیا ہو گا۔"

"اوہ، تم ٹھیک کہتے ہو۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"لیکن ہم یہ کس طرح معلوم کریں کہ ان تینوں میں سے کون اٹھ کر اندر گیا تھا؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"میں ابھی انکل خان رحمان سے معلوم کرتا ہوں۔"

محمود نے کہا اور اٹھ کر خان رحمان کے پاس چلا گیا — پھر ان کے کان پر جھک کر بولا:

"انکل، کیا آپ ایک بات بتا سکتے ہیں؟"

"ایک کیا دس بتا سکتا ہوں۔" انھوں نے سرگوشی کی: "بولو، کتنی باتیں بتاؤں۔"

"صرف اتنا بتا دیں کہ ملک عطا خان، سرداؤد یا انسپکٹر فیروز میں سے کون اندر گیا تھا — میں اس وقت کی بات پوچھ رہا ہوں جب آپ گھاس کے میدان میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ہم بم تلاش کرنے اندر چلے گئے تھے۔"

"مجھے سوچنے دو۔"

خان رحمان نے کہا اور ذہن پر زور دینے لگے۔ آخر بولے:

"میرے خیال میں ان تینوں میں سے کوئی بھی اندر نہیں گیا تھا۔"

"کیا آپ کو پورا یقین ہے؟" محمود نے مایوس ہو کر کہا۔

"یقین تو ہے...... لیکن پورا نہیں ہے۔" خان رحمان نے مسکرا کر کہا۔

"تو ذرا اس یقین کو پورا کرنے یا ختم کرنے کے لیے پروفیسر انکل سے بھی

سوال کریں — ان سے بھی کوئی یقینی بات معلوم نہ ہو تو شیخ صاحب اور خان صاحب سے معلوم کریں۔"

"کیوں، کیا یہ کوئی بہت اہم سوال ہے؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"جی ہاں، ہم اصل مجرم کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں — ہو سکتا ہے کہ وہ بم کے منصوبے کے ناکام ہونے کے بعد کوئی اور حرکت کر بیٹھے۔" محمود نے وجہ بتائی۔

"اوہ، تم ٹھیک کہتے ہو — اپنی جگہ پر بیٹھو — میں ابھی ان لوگوں سے سوال کر کے جواب تم تک پہنچاتا ہوں۔"

خان رحمان نے کہا اور پروفیسر داؤد کے کان میں سوال دہرا دیا۔

"بھئی مجھے تو جہاں تک یاد پڑتا ہے، ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں گیا۔" پروفیسر بولے۔

"کیا آپ کو یقین ہے؟" خان رحمان نے پوچھا۔

"ہاں، تقریباً یقین ہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"بہت خوب، مجھے بھی اتنا ہی یقین تھا، جتنا آپ کو —" خان رحمان دلکش انداز میں مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" پروفیسر داؤد چونکے۔

"مطلب یہ کہ پورا یقین نہیں تھا۔"

"لیکن تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟" پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ میں نے نہیں — محمود، فاروق اور فرزانہ نے پوچھا ہے۔ وہ اس

بات کا یقینی جواب چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجرم ان تینوں میں سے کوئی ایک ہے اور بم کے نہ پھٹنے کی صورت میں وہ کوئی اور چال چل سکتا ہے۔"

"اُف خدا، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں — غضب کا دماغ ہے ان کا — ہمارا تو اس طرف خیال بھی نہیں گیا اور یہ جمشید کہاں چلا گیا۔" پروفیسر داؤد گھبرا گئے —

"وہ میرے خیال میں مجرم کے گرد اپنا جال مکمل کرنے گیا ہے۔" خان رحمان مسکرائے — "تاکہ اس کے فرار ہونے کے تمام راستے بند ہو جائیں۔"

"کہیں مجرم ہمارے ہی فرار ہونے کے راستے نہ بند کر دے۔" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"فکر نہ کریں اور یہ سوال ذرا شیخ صاحب سے کریں۔"

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے کہا اور آئی جی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب سے یہی سوال کیا۔

ان کی طرف سے بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا کہ یہ تینوں اندر جاتے ہوئے نہیں دیکھے گئے؛ البتہ یہ بات یقین سے وہ بھی نہ کہہ سکے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ تک ان کا جواب پہنچایا گیا۔

تینوں سوچ میں ڈوب گئے۔

"کیوں نہ ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ تینوں اندر نہیں گئے۔" آخر محمود نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"اس سے ہوگا یہ کہ یہ تینوں شک سے بری ہو جائیں گے۔" فاروق نے

مسکرا کر کہا۔

"نہیں — یہ بات نہیں — یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجرم کو اپنے منصوبے کی کامیابی کا اس قدر یقین ہو کہ اس نے اندر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو — اس صورت میں ہم مجرم کو کس طرح پہچانیں گے۔" محمود نے فاروق کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔

"اس کی آسان ترین ترکیب یہ ہے کہ ہم تینوں سے باری باری پوچھ لیں کہ کیوں جناب، بم آپ نے تو فانوس میں نہیں رکھوایا تھا۔" فاروق بول اٹھا۔

"تمہاری ترکیب بھی بہت اچھی ہے — ذرا خود ہی جا کر ان سے معلوم کر آؤ۔" فرزانہ نے جل بھن کر کہا۔

"ترکیب میں نے بتا دی ہے — معلوم تم کر آؤ۔" اس نے بھی فوراً جواب دیا۔ محمود کو ہنسی آ گئی۔

"منحوس، وزیراعظم کی تقریر ہو رہی ہے — لوگ سمجھیں گے کہ انہوں نے کوئی ہنسی والی بات کی ہے اور کہیں سب نہ ہنسنے لگ جائیں۔ اس سے پتا ہے کیا ہو گا — وزیراعظم سمجھیں گے کہ اس ملک کے سب لوگ بے وقوف ہیں۔" فاروق رکے بغیر بولتا چلا گیا۔

"تمہاری زبان سے خدا بچائے۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

"اسی نے تو یہ زبان عطا کی ہے۔" فاروق کہہ رکنے والا تھا۔

"اُف توبہ۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"فرزانہ اسے چھوڑو — آؤ ہم کوئی کام کی بات سوچیں۔" محمود نے تنگ آ کر کہا۔

"تو فرزانہ نے مجھے پکڑ کر رکھا ہے۔" فاروق شریر انداز میں مسکرایا۔

اسی وقت ہال میں تالیاں گونج اٹھیں — لوگ وزیراعظم کی کسی بات پر خوش ہو کر زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے۔

"تم بھی تالیاں بجاؤ۔" محمود نے کہا اور تینوں تالیاں بجانے لگے۔

عین اسی وقت انہوں نے انسپکٹر جمشید کو اپنی طرف آتے دیکھا —

مجرم سامنے

انسپکٹر جمشید ان کے قریب سے گزرتے ہوئے شیخ صاحب کے قریب پہنچے اور جھک کر بولے:

"میں لاؤڈ سپیکر پر ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں۔"

"وزیر اعظم کی تقریر کے دوران؟" شیخ صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں، ان کی تقریر کے فوراً بعد۔"

"ٹھیک ہے — ضرور کر لینا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ — آپ مجھے یہ اختیار دے چکے ہیں کہ بم کے سلسلے میں جسے چاہوں گرفتار کر سکتا ہوں اور جو قدم چاہوں اٹھا سکتا ہوں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

"پھر اعتراض نہ کیجیے گا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"تم کسے گرفتار کرنا چاہتے ہو؟" شیخ صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

"جناب، یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے — وہ کوئی بھی ہو — اگر مجرم ہے تو اسے ضرور گرفتار کرنا چاہیے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اسے صدرِ مملکت اور مہمان وزیر اعظم کے سامنے

بے نقاب کیا جائے تاکہ انہیں بھی معلوم ہو جائے کہ دشمن ملک کس کس طرح سے ہمارے تعلقات بگاڑنے پر تلا ہوا ہے۔"

"بہت اچھی تجویز ہے۔ میں تمہاری تائید کرتا ہوں اور اگر اس پر کوئی اعتراض ہوا تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"مجھے آپ ہی کی تائید کی ضرورت ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

اسی وقت وزیر اعظم نے اپنی تقریر ختم کر دی — ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ انسپکٹر جمشید نے ہال میں موجود تمام لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور عین اس وقت انہیں یقین ہو گیا کہ مجرم کون ہے۔ اس سے ان پر ایک جوش کی حالت طاری ہو گئی — وہ فوراً مائیک کی طرف بڑھے اور پر سکون آواز میں کہنے لگے:

"خواتین و حضرات، تالیوں کی گونج میں ایک اہم اعلان بھی سن لیجیے — کھانے کے فوراً بعد ایک بہت ہی اہم راز سے پردہ اٹھایا جائے گا — اس لیے تمام حاضرین سے درخواست ہے کہ وہ کھانے کے بعد بھی تشریف رکھیں کیونکہ معاملہ دونوں ملکوں کے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ میں سے دونوں ملکوں سے جنہیں محبت ہے، ہمدردی ہے، وہ ہرگز ہرگز نہیں جائیں گے بلکہ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہوں گا کہ اس راز سے پردہ اٹھنے سے پہلے جانے والے ملک اور قوم کے فرمانبردار ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیا آپ کو میری بات سے اتفاق ہے؟"

انسپکٹر جمشید یہ کہہ کر خاموش ہو گئے — مجمعے میں ایک شور سا گونجا اور

بے شمار آوازیں آئیں — کوئی نہیں جائے گا — ہم ملک اور قوم کے وفادار ہیں — ہمیں ملک اور قوم سے محبت ہے —

"بہت خوب، میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف چلے۔ جہاں وزیر اعظم انہیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے صدرِ مملکت سے پوچھا:

"یہ کون ہے!"

"یہ انسپکٹر جمشید ہے — اس کے ہوتے ہوئے ملکی اور غیر ملکی سازشیں پنپنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں — مجرم اس سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں — ملک اور قوم کے لیے اس نے ہمیشہ نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں — اب اس وقت کے اعلان ہی کو لے لیجیے — کتنا عجیب اعلان ہے، لیکن میں نے ناگواری کا اظہار اس لیے نہیں کیا کہ ضرور اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد ہو گا — انسپکٹر جمشید ملک اور قوم کے خلاف کوئی قدم اٹھائے، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا — کھانے کے بعد آپ سے ملواؤں گا — اگر کبھی آپ کو اپنے ملک میں کسی سازش کا امکان بھی نظر آئے تو اسے پیغام بھیج دیجیے گا — یہ اُڑ کر آپ کے پاس پہنچے گا اور سازش کو جڑ سے پکڑ کر اکھاڑ پھینکے گا — مزے کی بات یہ کہ یہ خود تو جو ہے سو ہے — اس کے تین بچے اور بھی زیادہ حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہیں — خطرات میں یوں کود پڑتے ہیں جیسے کوئی فٹ بال کا کھلاڑی کھیل کے میدان میں اترتا ہے یا جیسے کوئی تیراک تالاب میں کودتا ہے — انہوں نے بھی اس وقت تک نہ جانے

کتنے مجرموں کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔" صدرِ مملکت یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"بہت خوب، پھر تو یہ چاروں بہت کام کے ہیں — میں ان سے ضرور ملوں گا اور یہ بھی دیکھوں گا کہ اس وقت کا یہ اعلان کیا اہمیت رکھتا ہے۔"

اچانک ایک آدمی ہال میں داخل ہوا — یہ ٹیلی فون آپریٹر تھا۔ آتے ہی اس نے سردار ابراہیم کی طرف قدم بڑھائے اور ذرا اونچی آواز میں بولا:

"آپ کا فون آیا ہے — پیغام دینے والے نے کہا ہے کہ آپ کے بڑے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ شدید زخمی ہو گیا ہے۔"

"اوہ۔"

سردار ابراہیم اٹھ کر کھڑا ہو گیا — اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا:

"مجھے جانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ شیخ صاحب کی طرف لپکا۔

"شیخ صاحب، میرے بچے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اس لیے مجھے تو اجازت دیں۔"

"جی اچھا۔"

شیخ صاحب نے بے خیالی میں کہا — وہ تو صدرِ مملکت اور مہمان وزیر اعظم کی طرف دیکھ رہے تھے جو باتوں میں مصروف تھے۔

شیخ صاحب کے 'جی اچھا' کہتے ہی سردار ابراہیم دروازے کی طرف لپکے۔ ان کے پیچھے ٹیلی فون آپریٹر بھی تھا — وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئے کیونکہ

وہاں انسپکٹر فیروز دس کانسٹیبلوں سمیت موجود تھا - اس کے ہاتھ میں پستول تھا — اس نے ادب سے کہا :

"مجھے افسوس ہے جناب، کھانے سے پہلے کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا ۔"

"کیا مطلب ؟" سردار ابراہیم نے چونک کر کہا ۔

"جی ہاں، ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ ہال میں موجود کوئی بھی شخص کھانا کھانے سے پہلے ہال سے باہر نہیں جا سکتا ۔" انسپکٹر فیروز نے نرم آواز میں کہا ۔

"یہ کس کے حکم سے ہو رہا ہے ؟" سردار ابراہیم کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا : "سنو، میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے — وہ شدید زخمی ہے — میں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رک سکتا اور تم کہہ رہے ہو کہ کھانا کھانے سے پہلے کوئی نہیں جا سکتا — کیا تمہارا دماغ پھر گیا ہے — کیا تم اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا چاہتے ہو — اگر تم نے میرا راستہ روکا تو میں تمہیں کھڑے گھاٹ نوکری سے نکلوا دوں گا اور پھر پورے ملک میں تم کہیں ملازمت نہ کر سکو گے ۔ ہٹو، مجھے راستہ دو ۔" اس نے غرا کر کہا ۔

"مجھے افسوس ہے جناب، میں اپنے فرض سے مجبور ہوں، نوکری رہے یا جائے، میں اپنا فرض ضرور ادا کروں گا ۔" انسپکٹر فیروز بولا ۔

"اچھی بات ہے — میں شیخ صاحب سے بات کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں، تم مجھے کیسے روک سکتے ہو ۔"

غصے میں بھنایا ہوا وہ واپس ہال میں آیا — آپریٹر باہر نکلنے کے لیے آگے بڑھا تو انسپکٹر فیروز نے اس سے کہا :

"مجھے افسوس ہے تم بھی نہیں جا سکو گے ۔"

"لیکن میں ٹیلی فونوں پر مقرر ہوں، اور فون کی اطلاع دینے آیا تھا ۔"

"بے شک یہ ٹھیک ہے لیکن مجھے حکم ملا ہے کہ ہال کے اندر کوئی آ تو سکتا ہے ۔ جا نہیں سکتا — جب تک کہ جانے کے احکام نہ دے دیے جائیں ۔"

"یہ کیا بات ہوئی — اور اگر اس دوران کوئی ضروری فون آ گیا تو ۔" اس نے جھنجلا کر کہا —

"یہ میں نہیں جانتا ۔" انسپکٹر فیروز نے کہا ۔

اتنی دیر میں سردار ابراہیم شیخ صاحب تک پہنچ چکے تھے :

"شیخ صاحب، میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیا چکر ہے — مجھے کیوں روکا گیا ہے — میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور مجھے جانے نہیں دیا جا رہا ہے ۔"

"کیا مطلب ؟ آپ کو کس نے روکا ہے ؟" شیخ صاحب نے حیران ہو کر کہا —

"نیشنل ہال کے نگران انسپکٹر فیروز نے وہ ہال کے دروازے پر کانسٹیبلوں کے ساتھ موجود ہے — اس کا کہنا ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے کوئی شخص نہیں جا سکتا ۔"

"یہ کیا بات ہوئی ۔ ایسا غلط حکم اسے کم از کم میں نے تو دیا نہیں ۔ آیئے میں اس سے پوچھتا ہوں ۔"

انہوں نے کہا اور اٹھ کر سردار ابراہیم کے ساتھ دروازے پر آئے :

"انسپکٹر فیروز، سردار صاحب کو باہر جانے سے کیوں روکا ہے؟" شیخ صاحب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"جی، مجھے یہی حکم ملا ہے۔" اس نے با ادب ہو کر کہا۔

"یہ حکم تمہیں کس نے دیا ہے؟" انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

"جی انسپکٹر جمشید نے۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟"

شیخ صاحب کے منہ سے نکلا — وہ حیرت زدہ رہ گئے — اب انہیں وہ اعلان یاد آیا جو انسپکٹر جمشید نے ہال میں کیا تھا کہ کوئی شخص ہال سے باہر نہ جائے۔

"بھئی، ان کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، کم از کم انہیں تو جانے دو۔" شیخ صاحب نے درخواست کرنے والے انداز میں کہا۔

سردار ابراہیم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولے :

"شیخ صاحب، آپ آئی جی ہو کر ایک انسپکٹر سے درخواست کر رہے ہیں۔ اسے حکم کیوں نہیں دیتے کہ میرا راستہ چھوڑ دے — نہ جانے میرے بچے کا کیا حال ہو گا۔"

"میں انسپکٹر فیروز کو حکم نہیں دے سکتا۔" انہوں نے بے بسی سے کہا۔

"وہ کیوں؟" سردار ابراہیم نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ اسے جو حکم دیا گیا ہے، یہ اس کی تعمیل کرنے پر مجبور ہے۔" شیخ صاحب بولے۔

"لیکن وہ حکم ایک انسپکٹر کا دیا ہوا ہے کوئی صدر مملکت کا نہیں اور پھر ایک انسپکٹر اس قسم کا حکم کس طرح دے سکتا ہے — اسے کیا اختیار ہے کہ ہال میں موجود اتنے بڑے بڑے افسروں کو جانے سے روک دے۔"

"آپ شاید وہ اعلان بھول گئے ہیں جو ابھی ابھی انسپکٹر جمشید نے مائک کے ذریعے کیا ہے — آپ کو یاد ہو گا — اس اعلان پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔" شیخ صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ عام حالات میں مجھے بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا — لیکن میرا بیٹا —"

"آپ کے بیٹے کو ہسپتال پہنچایا جا چکا ہو گا — آپ اس کے لیے اور کیا کر سکتے ہیں —"

"مجھے افسوس ہے، آپ اپنے ایک انسپکٹر کی طرفداری میں میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ اب میں وزیرِ خارجہ سے بات کروں گا —" اس نے تنگ آ کر کہا۔

"وہ بھی ہال میں موجود ہیں۔" شیخ صاحب مسکرائے۔

"ٹھیک ہے۔" سردار ابراہیم نے جھنجلا کر کہا — اور تقریباً دوڑتے ہوئے وزیرِ خارجہ تک آئے۔

"معاف کیجیے گا جناب، یہ سب میرے لیے بالکل ناقابلِ برداشت ہے۔"

"کیا ہوا سردار صاحب۔" وزیرِ خارجہ بولے۔

"میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے - ابھی ابھی فون آیا ہے، لیکن انسپکٹر جمشید کا حکم ہے کہ کوئی شخص ہال سے باہر نہیں جا سکتا — آخر کیوں — یہ اتنے اختیارات اُسے کس نے دیے ہیں "

" اگر یہ ہدایت انسپکٹر جمشید نے دی ہے تو اس کی ضرور کوئی خاص وجہ ہوگی — آپ براہِ راست اس سے بات کریں — اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا تو کوئی بھی آپ کو نہیں روکے گا "

"کیا میں اتنا کم حیثیت ہو گیا ہوں — میرے تعلقات آپ سے ہیں، وزیرِ اعظم سے ہیں، صدرِ مملکت سے ہیں اور میں باہر جانے کے لیے ایک انسپکٹر سے اجازت لوں — آخر یہ سب کیا ہے ؟"

" مجھے افسوس ہے، اس کے معاملات میں مَیں دخل نہیں دے سکتا "

"بہت خوب، میں اسے دیکھ لوں گا "

سردار ابراہیم نے تلملا کر کہا اور انسپکٹر جمشید کی طرف بڑھے - وہ انہی کی طرف دیکھ رہے تھے -

"آئیے سردار صاحب، میں جانتا ہوں، آپ باہر جانے کے لیے بہت بے چین ہیں — کیونکہ آپ کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے - مجھے بہت افسوس ہوا یہ خبر سُن کر — " یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے -

"آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور پھر بھی انسپکٹر فیروز میرا راستہ روک رہا ہے"

"تو آپ باہر جانا چاہتے ہیں — " انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز میں مسکرائے —

اور محمود، فاروق اور فرزانہ چونک اٹھے — اُن کے مسکرانے کا یہ انداز اُن کے لیے نیا نہیں تھا -

" ہاں — ہاں — ہاں — کتنی بار کہوں — "

انسپکٹر جمشید نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی — نو بجنے میں صرف دو منٹ باقی تھے — سردار ابراہیم بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے - شاید انہیں بیٹے کا خیال ستا رہا تھا - پھر اچانک انسپکٹر جمشید اٹھے اور بلند آواز میں بولے :

" حضرات، معاف کیجیے گا، میں آپ سب کی توجہ کچھ دیر کے لیے اپنی طرف کرنا چاہتا ہوں — آپ کو یاد ہوگا، ابھی ابھی میں نے اعلان کیا تھا کہ کھانے کے بعد ایک بہت اہم راز سے پردہ اٹھایا جائے گا جو دونوں ملکوں سے متعلق ہوگا اور یہ کہ اس وقت تک سب لوگ ٹھہریں — میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہال میں موجود جو شخص اس راز کے ظاہر ہونے سے پہلے جائے گا، اُسے ملک اور قوم سے کوئی محبت نہیں ہوگی — کیا آپ لوگوں کو یاد ہے ؟"

" یاد ہے، یاد ہے " ہال میں آوازیں اُبھریں -

" یہ کیا چکر ہے ؟" مہمان وزیرِ اعظم نے صدرِ مملکت سے پوچھا -

"کوئی اہم بات معلوم ہوتی ہے — "

صدرِ مملکت بولے — دونوں انسپکٹر جمشید کو بغور دیکھ رہے تھے - اسی وقت انہوں نے انہیں کہتے سنا :

" تو پھر دیکھ لیجیے، سردار ابراہیم صاحب ہال سے باہر جانے کے

لیے بے تاب ہیں۔"

یہ جملہ سن کر وزیر خارجہ اور صدرِ مملکت کا منہ بن گیا کیونکہ دونوں کے سردار ابراہیم کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے ۔۔۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسپکٹر جمشید سردار ابراہیم کی بھرے مجمعے میں بے عزتی کریں گے۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید کہہ رہے تھے :

"آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انہیں ملک اور قوم سے کتنی محبت ہے۔"

"یہ غلط ہے، میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس لیے میں جانا چاہتا ہوں۔" سردار ابراہیم نے لال پیلا ہو کر کہا۔

"آپ کو وطن زیادہ عزیز ہے یا بیٹا؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن تم جس راز سے پردہ اٹھاؤ گے، وہ مجھے دوسروں سے معلوم ہو ہی جائے گا۔" سردار ابراہیم بولے۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے ۔۔۔ کئی آوازیں ابھریں۔" انہیں جانے دیا جائے ۔۔۔"

"ٹھہریے حضرات، مجھے ان کے جانے میں تو کوئی اعتراض نہیں ۔۔۔ اعتراض ہے تو اس بات پر کہ ان کا تو دراصل کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔"

"کیا بیٹا ہے ہی نہیں ۔۔۔" لوگ حیران رہ گئے۔

"جی ہاں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے، میں تصدیق کر چکا ہوں۔ ابھی ابھی جب میں ہال سے باہر گیا تھا تو میں نے ان کے گھر فون کیا تھا۔ میں نے فون پر جواب دینے والے ملازم سے کہا تھا کہ میں سردار ابراہیم سے بات کرنا

چاہتا ہوں ۔۔۔ اس نے بتایا کہ سردار صاحب نہیں ہیں تو میں نے ان کے بیٹے سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اس نے بتایا کہ سردار صاحب کے تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے ۔۔۔ بس ان کی ایک بیگم ہیں جو اس وقت کہیں گئی ہوئی ہیں ۔۔۔ تو جناب جب ان کا کوئی بیٹا ہے ہی نہیں تو ایکسیڈنٹ کیسا ۔۔۔ پھر یہ کیوں جانے کے لیے بے چین ہیں۔"

یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید نے ڈرامائی انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ لوگ دنگ رہ گئے ۔۔۔ اچانک سردار ابراہیم بھڑک کر دروازے کی طرف بھاگے ۔۔۔ لیکن انسپکٹر فیروز کے پستول اور کانسٹیبلوں کی بندوقوں نے انہیں روک لیا۔ ۔۔۔ اچانک سردار ابراہیم پوری قوت سے گلا پھاڑ کر چلایا :

"بے وقوفو، مجھے جانے دو۔"

"لیجیے ۔۔۔ اب ہم سب بے وقوف بھی ہو گئے ۔۔۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا سردار ابراہیم کا دماغ چل گیا ہے۔" شیخ صاحب نے حیران ہو کر کہا ۔۔۔

"آخر تم نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟" کسی نے کہا۔

"بکواس مت کرو ۔۔۔ مجھے جانے دو ۔۔۔ ورنہ تمہارے ساتھ میرے بھی پرخچے اڑ جائیں گے ۔۔۔" اس نے پھر چلا کر کہا ۔۔۔

"کیا مطلب ۔۔۔ کیا کہا ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی ۔۔۔" ہال میں موجود لوگ چلا اٹھے۔

"ابھی تو اس نے کام کی بات کی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں — ٹھیک نو بجے یہ عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے گی اور تم سب اس ملبے میں دفن ہو جاؤ گے — عمارت میں ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے۔"

"ہیں کیا!" آوازیں ابھریں — لوگ خوفزدہ ہو گئے — بہت سے اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوتے۔

"ہاں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں — سب کے سب مرنے والے ہیں۔ افسوس، میں بھی....."

"سردار صاحب، گھبرائیے نہیں — صرف آپ مرنے والے ہیں — باقی سب لوگ بچ گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ — سردار ابراہیم نے عمارت کے نیچے ٹائم بم ضرور رکھوا دیا تھا، لیکن میں اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں — ابھی میں آپ کو تفصیل سے سارے واقعات سناؤں گا — پہلے سردار صاحب کو گرفتار کر لوں — انسپکٹر فیروز، تم انہیں گرفتار کر لو اور ہاں، ٹیلی فون آپریٹر کو بھی گرفتار کرنا نہ بھولنا — وہ بھی سردار ابراہیم صاحب کا ساتھی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ٹیلی فون آپریٹر کی تلاش میں نظریں گھمائیں اور پھر چونک اٹھے۔ وہ مہمان وزیراعظم کے عین پیچھے پہنچ چکا تھا — اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا پستول تھا جس کی نالی کا رخ مہمان وزیراعظم کی کمر کی طرف تھا۔

آخری معرکہ

"تمہیں دیر ہو چکی ہے انسپکٹر جمشید — تمہارا کہانی سنانے کا انداز بہت دلچسپ تھا، اس لیے سب لوگ اس طرف متوجہ تھے، خود تم سردار ابراہیم کی طرف دیکھ رہے تھے — اگرچہ تم یہ جانتے تھے کہ میں بھی سردار صاحب کا ساتھی ہوں۔ لیکن تم نے مجھے کوئی اہمیت نہیں دی اور یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی تھی — اب صورت حال یہ ہے کہ میرے پستول کی نالی مہمان وزیراعظم کی پشت سے لگ رہی ہے۔"

ٹیلی فون آپریٹر کے الفاظ نے پورے ہال میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی۔ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے — انسپکٹر جمشید بھی ساکت و جامد رہ گئے۔ پھر انہوں نے انسپکٹر فیروز کو گھورا۔

"تم نے آپریٹر کو تلاشی لیے بغیر کیوں اندر آنے دیا۔" وہ گرج کر بولے:

ہال میں موت کا سناٹا طاری ہو چکا تھا۔

"مم..... میں نے تلاشی لی تھی، لیکن — یہ پستول شاید پہلے ہی یہاں پہنچا دیا گیا ہو گا۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"ہوں۔"

"بہت خوب، یہ کام کیا ہے تم نے میرے شیر۔" سردار ابراہیم نے

خوش ہو کر کہا' پھر وہ دوسری طرف مڑ کر بولا :

"انسپکٹر فیروز، اپنا پستول اور بندوقیں میرے حوالے کر دو ؛ ورنہ تمہارے مہمان وزیر اعظم کی خیر نہیں ۔"

انسپکٹر فیروز نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا — انھوں نے ہتھیار گرا دینے کی اجازت آنکھوں کے اشارے سے دے دی ۔ سب لوگ سکتے کے عالم میں بیٹھے یہ ڈرامہ دیکھ رہے تھے — ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے ۔ صورت حال بہت عجیب ہو گئی تھی — ذرا سی غلطی نے کایا پلٹ کے رکھ دی تھی اور اس وقت حالات کی باگ ڈور ایک بار پھر دشمنوں کے ہاتھوں میں تھی ۔

پستول اور بندوقیں نیچے گرا دیے گئے — سردار ابراہیم نے انہیں اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کی —

"اب ہم کیا کریں جناب ۔" ٹیلی فون آپریٹر نے سردار ابراہیم سے کہا ۔

"میں یہی سوچ رہا ہوں — ان لوگوں میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا ؛ ورنہ ہم اس ملک میں نہیں رہ سکیں گے — اوہ — ارے ہاں، بہت زوردار ترکیب ذہن میں آ گئی ہے — انسپکٹر جمشید، وہ بم یقیناً تمہارے ہینڈ بیگ میں موجود ہے — وہ نکال کر مجھے دے دو ۔"

انسپکٹر جمشید نے بے بسی سے ایک نظر پورے ہال پر ڈالی ۔ سب کا رنگ زرد ہو چکا تھا ۔ موت انہیں آنکھوں کے سامنے ناچتی دکھائی دے رہی تھی ۔ آخر انھوں نے بیگ میں سے بم نکال کر سردار ابراہیم کی طرف بڑھا دیا — یہ تکونی شکل کا تھا — ایک طرف اس میں ڈائل لگا ہوا تھا ۔ سردار ابراہیم نے ڈائل کو پھیر

گھما کر دیا اور نو بج کر دس منٹ وقت مقرر کر دیا ۔ اس کے بعد اس نے کہا :

"کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے انسپکٹر فیروز کا پستول اور بندوقیں بھی اٹھا لیں ۔

"پستول کا رخ مہمان وزیر اعظم کی طرف رکھتے ہوئے دروازے کی طرف قدم اٹھاؤ ۔" اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا ۔

اس نے ایسا ہی کیا — جلد ہی وہ اس کے پاس پہنچ گیا ۔ اب دونوں کندھے سے کندھا ملا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے ۔

"ہم دروازہ بند کر کے بم دروازے پر رکھ جائیں گے — یہ لوگ پانچ منٹ میں دروازہ نہیں توڑ سکیں گے ۔" سردار ابراہیم نے کہا ۔

"بہت خوب، زبردست ترکیب ہے ۔" ساتھی نے خوش ہو کر کہا ۔

"اور نو بج کر دس منٹ پر وہ ہو چکا ہو گا جو ہم چاہتے تھے ۔" سردار ابراہیم بولے ۔

"انسپکٹر جمشید کے سب پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے ۔" ساتھی نے کہا —

"ہاں، بڑا چالاک بنا پھرتا ہے ۔"

اب ان کا رخ دروازے کی طرف تھا — دونوں پستول ہال کے لوگوں کی طرف اٹھے ہوئے تھے — وہ ٹکٹکی باندھے پستول کی نالوں کی طرف دیکھ رہے تھے ۔ دروازہ بند ہونے کی دیر تھی کہ وہ سب موت کے منہ میں ہوتے ! گویا یہ دروازہ ان کی زندگی کا دروازہ تھا جو بند ہونے والا تھا ۔

اور پھر وہ دروازے پر پہنچ گئے۔ جونہی انھوں نے قدم باہر نکالے دو چیخیں فضا میں بلند ہوئیں اور وہ دونوں دروازے پر ہی اندر کی طرف اوندھے منہ گر پڑے۔

✲ ✲ ✲

کوئی نہ سمجھ سکا کہ کیا ہوا — انسپکٹر جمشید نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور دونوں پستول اور بم ان کے ہاتھوں میں سے نکال لیے اور بم بے کار کر دیا — اس وقت فرزانہ اندر داخل ہوئی — اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک پائپ تھا — اب انھیں معلوم ہوا کہ فرزانہ نے لوہے کا پائپ دونوں کے سروں پر پوری قوت سے دے مارا تھا۔

"وہ مارا۔" شیخ صاحب کے منہ سے نکلا۔

"بہت خوب، شاندار — اس بچی نے کمال کر دیا۔" کسی نے کہا۔

"حیرت ہے۔ کون ہے یہ بچی؟" مہمان وزیراعظم نے پوچھا۔

"یہ انسپکٹر جمشید کی ہی بچی ہے۔" صدرِ مملکت نے بتایا۔

"حیرت ہے — سوال یہ ہے کہ یہ ہال سے باہر کس وقت نکل گئی۔" مہمان وزیراعظم نے کہا۔

"یہ ابھی خود ہی سب کچھ بتائے گی۔" صدرِ مملکت بولے۔

پھر سب اطمینان سے بیٹھ گئے — دونوں مجرموں کو باندھ لیا گیا۔ فرزانہ نے بتایا:

"جب سردار ابراہیم کو باہر نہ جانے دیا گیا تو ٹیلی فون آپریٹر نے دیوار کے

ساتھ لگ کر مہمان کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ جس وقت ابا جان نے یہ بتایا، کہ سردار ابراہیم کے تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے تو میں چونک اٹھی۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہی آیا — تو کیا ٹیلی فون آپریٹر نے آ کر جھوٹ بولا تھا — اگر اس نے جھوٹ بولا تھا تو پھر وہ ضرور مجرم کا ساتھی تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کے لیے نظریں اٹھائیں تو وہ دروازے کے قریب دکھائی نہ دیا — اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ دیوار سے لگ کر کھسک رہا تھا۔ بس اسی وقت میں سمجھ گئی کہ کیا ہونے والا ہے — میں بھی دیوار کے ساتھ لگ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی — جس وقت انسپکٹر فیروز اور ان کے ساتھی ہال کے اندر آئے تو مجھے باہر نکلنے کا موقع مل گیا — باہر نکل کر میں نے کسی ہتھیار کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، لیکن نیشنل ہال میں ہتھیار کہاں تھا — آخر میری نظر دروازے کے ساتھ لٹکے ہوئے پردوں پر پڑی۔ یہ پردے لوہے کے پائپوں میں پروئے ہوئے تھے — بس میں نے ایک پائپ اتار لیا اور ہال کے دروازے پر پہنچ کر اندر ہونے والی کارروائی کو سننے لگی — مجرموں کا پورا پروگرام میں نے اطمینان سے سُنا — ان کے باہر نکلنے تک کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لیے میں باہر کھڑی انتظار کرتی رہی۔ یہ دونوں الٹے قدموں دروازے کی طرف آ رہے تھے اس لیے مجھے نہیں دیکھ سکے۔ جوں ہی انھوں نے قدم باہر نکالنے کے لیے اٹھائے، میں نے ایک سیکنڈ کے اندر دونوں کے سروں پر ایک ایک پائپ مار دیا۔"

یہ کہہ کر فرزانہ خاموش ہو گئی۔ ہال میں کئی لوگوں نے تالیاں بجا دیں، بس پھر کیا تھا، سبھی تالیاں بجانے لگے۔ ان میں بڑے بڑے افسر ہی نہیں صدرِ مملکت

اور مہمان وزیرِ اعظم بھی تھے اور یہ لوگ تالیاں کیوں نہ بجاتے — موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے تھے۔

"میں کھانا کھانے کے بعد ان لوگوں سے ضرور ملوں گا" مہمان وزیرِ اعظم نے صدرِ مملکت سے خوش ہو کر کہا۔

"ضرور، ضرور —"

کھانا شروع کرنے سے پہلے انسپکٹر جمشید نے اس سوال کے جواب میں بتایا کہ یہ سب آخر چکر کیا تھا:

"دراصل ہمارا دشمن ملک نہیں چاہتا کہ یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ جائیں — وہ سمجھتا ہے کہ اگر دونوں ملک متحد ہو گئے تو اس کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا جب کہ وہ ہمیں الگ کر کے خود ہمارے لیے خطرات پیدا کرنا چاہتا ہے — مہمان وزیرِ اعظم نے ہمارے ملک کے دورے کا اعلان آج سے ایک ماہ پہلے کیا تھا؛ چنانچہ اسی وقت دشمن ملک نے ہمارے ملک میں موجود اپنے جاسوسوں کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ مہمان وزیرِ اعظم اس ملک میں آنے کے بعد زندہ بچ کر نہ جائیں — غیر ملکی جاسوسوں کی باگ ڈور یہاں سردار ابراہیم کے ہاتھ میں تھی — یہ شخص آج سے تیس سال پہلے آیا تھا۔ جب کہ ملک نیا نیا بنا تھا — اس نے اپنی چالاکی سے ملک میں خاص مقام پیدا کر لیا — یہاں تک کہ وزیروں سے بھی تعلقات بنا لیے۔ ظاہر میں یہ ملک کی بہتری کے لیے کام کرتا پھرتا تھا — غریبوں کا دم بھرتا پھرتا تھا کہ لوگ اسے بہت اچھا آدمی سمجھنے لگ جائیں اور ہوا بھی یہی — یہ روز بروز اہمیت

اختیار کرتا چلا گیا — یہاں تک کہ ایک سرکاری محکمے کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا — یہ ابھی نہ جانے کتنا عرصہ ملک کو نقصان پہنچاتا رہتا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا اور یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ عین اس وقت اس نے چوکیدار کو فون کیا جب محمود نے اپنے دوست کو فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا، خدا کی قدرت کہ لائن ادھر بھی مل گئی اور محمود نے بم رکھے جانے کے بارے میں گفتگو سن لی — اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اس وقت تک ہم سب صاف ہو چکے ہوتے"

پھر انہوں نے نچلے ہال میں پیش آنے والے واقعات تفصیل سے سنائے — یہ واقعات سن کر ہال میں موجود لوگ دنگ رہ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اس قدر زبردست سازش کا شکار ہونے سے بال بال بچے ہیں۔ گفتگو کے دوران انسپکٹر جمشید نے کہا:

"چوکیدار کو شروع میں میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ دراصل وہ بہت گہرا آدمی تھا — تالے کے سوراخ میں سے یہ دیکھتا رہا کہ ہم بم کی تلاش میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں — اگر ہم ناکام ہو جاتے تو وہ بھی دخل نہ دیتا، لیکن جوں ہی محمود کا خیال چھت کی طرف گیا، اس نے دروازے پر دستک دے دی — میں نے دروازہ کھولا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا، پھر جب میں نے اس پر قابو پا لیا تو اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا — وعدہ معاف گواہ بننے پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن وہ لمحہ میرے لیے سب سے زیادہ چونکا دینے والا تھا جب اس نے فانوس میں سے بم کی بجائے سٹین گن نکال لی۔ دراصل یہ چیزیں تو وہاں کئی دن پہلے ہی رکھی جا چکی تھیں"

انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے — لوگوں نے سوالات شروع کر دیے اور وہ باری باری مسکرا مسکرا کر ان کے جوابات دیتے رہے — جب تمام لوگوں پر سب باتیں واضح ہو چکیں تو تب جا کر سوال و جواب کا یہ سلسلہ ختم ہوا اور اس طرح کھانا پورے پندرہ منٹ دیر سے شروع ہوا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمان وزیرِ اعظم اور صدرِ مملکت کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے — فوراً ہی صدرِ مملکت کے سیکرٹری واپس آئے اور انسپکٹر جمشید سے بولے:

"جناب، آپ ابھی جائیں گے نہیں — مہمان وزیرِ اعظم آپ سے اور آپ کے بچوں سے ملاقات کریں گے۔"

"جی بہت بہتر —" انہوں نے کہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد انہیں مہمان کے سامنے لے جایا گیا۔ مہمان وزیرِ اعظم نے اٹھ کر انسپکٹر جمشید سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، پھر محمود، فاروق اور فرزانہ سے ہاتھ ملایا اور ان کے گالوں پر تھپکی دیتے ہوئے بولے:

"میں آپ چاروں کو اپنے ملک کے دورے کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ کو مہمان بنا کر ہم فخر محسوس کریں گے اور جب میں وطن جا کر شہنشاہ فرزوق کو آپ لوگوں کے بارے میں بتاؤں گا تو یقیناً وہ بھی آپ سے ملنا پسند کریں گے، بلکہ شدت سے خواہش محسوس کریں گے۔"

ان کے خاموش ہوتے ہی فاروق سے نہ رہا گیا۔ وہ بول اٹھا:

"معاف کیجیے گا جناب، آپ ہمیں دعوت نہ ہی دیں۔"

"کیا مطلب! کیا آپ لوگ ہمارا ملک دیکھنا پسند نہیں کریں گے؟"

انھوں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

اور انسپکٹر جمشید اور دوسرے فاروق کو گھورنے لگے، کیونکہ وہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ فاروق کیا کہنا چاہتا ہے۔ فاروق نے ان کی گھورتی نظروں کو مسکرا کر دیکھا اور بولا:

"جی، وہ..... بات یہ ہے..... ہم جہاں بھی جاتے ہیں، جاسوسی چکر شروع ہو جاتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم آپ کے ہاں جائیں اور کوئی چکر شروع ہو جائے۔"

اب فاروق کی بات ان سب کی سمجھ میں آئی — وہ مسکرانے لگے۔ مہمان وزیرِ اعظم نے بھی مسکرا کر کہا:

"کوئی بات نہیں، آپ لوگوں کے لیے ہم یہ سب کچھ برداشت کریں گے۔"

"اگر آپ چکر چلوانا ہی چاہتے ہیں تو پھر مجبوری ہے — ہم آ جائیں گے۔" فاروق نے معصومیت سے کہا۔

"بلکہ یہ کہنا چاہیے، آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بھی بول اٹھی۔

محمود نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا:

"چونکہ یہ دونوں آپ سے بات کر چکے ہیں، اس لیے مجھے بھی چاہیے کہ چپ نہ رہوں۔ آپ کو جب کبھی ہماری ضرورت محسوس ہو، آپ ہمیں بلا لیجیے گا۔ اس طرح ہمارا آنا اچھا بھی لگے گا۔"

"تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ کوئی ضرورت ضرور ہی پڑے۔" مہمان نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں، خدانخواستہ ہم ایسا کیوں چاہنے لگے؛ تاہم کوئی ضرورت پیش آتے وقت دیر بھی کیا لگتی ہے — آج ہی کے واقعات کو لے لیجیے۔"

"ہوں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"معاف کیجیے جناب، ان تینوں کو تو یونہی ادھر ادھر کی ہانکنے کی عادت ہے — آپ معزز مہمان ہیں، آپ کا وقت بہت قیمتی ہے — میں صرف اتنا کہوں گا کہ ہم ہر خدمت کے لیے اور آپ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح اور ہر وقت تیار ہیں۔ چاہے اسی وقت ساتھ لے چلیے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بہت خوب، یہ ہوئی نا بات۔"

"آخر کو بازی ابا جان ہی کے ہاتھ رہی۔" فاروق نے مایوسانہ لہجے میں کہا اور سب کو ہنسی آگئی۔

پھر وہ ان سے رخصت ہوئے — رخصت ہوتے وقت بھی انھوں نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا اور وہ باہر نکل آئے۔

واپسی پر محمود نے پوچھا:

"ابا جان، کیا آپ کو شروع سے ہی سردار ابراہیم پر شک تھا؟"

"نہیں تو، میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجرم ہوگا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ کو کب معلوم ہوا؟"

"پہلے تم بتاؤ — تم کسے مجرم سمجھتے رہے۔" انھوں نے پوچھا۔

"سچ بات تو ہے ابا جان کہ میں تو انسپکٹر فیروز کو مجرم سمجھتی رہی — میرے اس خیال کی وجہ یہ تھی کہ اس کی موجودگی میں ہال میں سٹین گن اور بم کیسے آسکتے تھے — لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جب اتنا بڑا افسر مجرم ہو تو وہ سٹین گن اور بم تو کیا ہاتھی اور گھوڑے بھی اندر لے جانا چاہے تو لے جا سکتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اور تم فاروق — تمھارا کیا خیال تھا؟"

"میرا خیال تھا کہ ملک عطا خان مجرم ہے — کیونکہ باغ میں اس نے ہماری خوب مخالفت کی تھی۔"

"اور میں سردار داؤد کو مجرم سمجھ بیٹھا تھا — اس نے بھی ملک عطا خان کا زور شور سے ساتھ دیا تھا۔"

"ہوں، لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دونوں محب وطن ہیں اور با اصول آدمی ہیں۔"

"جی ہاں، اب تو معلوم ہو چکا ہے۔" فاروق بولا۔

"اور آپ نے نہیں بتایا، کہ مجرم کو کب پہچانا۔" محمود نے پوچھا۔

"لیکن یہ سوال تو میں تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے مجرم کو کب اور کس طرح پہچانا۔"

"جی، کیا مطلب — پہچانا آپ نے، اور یہ ہم بتائیں کہ کب اور کس

طرح؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں، یہی تو بات ہے ۔۔۔ تم ہی بتاؤ گے ۔۔۔ سوچو، ذہن پر زور دو۔ میں تمہارا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ دیکھو، کہیں اس امتحان میں فیل نہ ہو جانا ۔۔۔ ویسے میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں، کہ جب میں پہلی مرتبہ ہال میں داخل ہوا تھا تو سردار ابراہیم نے مجھے بری طرح گھور کر دیکھا تھا، جیسے مجھے زندہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی ہو، لیکن اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ مجرم یہی شخص ہو گا ۔۔ اس کے بارے میں تو مجھے اس وقت معلوم ہوا جب وزیر اعظم نے تقریر ختم کی ۔۔"

"تقریر ختم کی؟" محمود کے منہ سے سوالیہ انداز میں نکلا۔

"ہاں۔"

تینوں سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ اس وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا رہے تھے جب مہمان تقریر کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگے، تقریر ختم ہونے کے بعد ان کے والد نے مجرم کو کیسے پہچان لیا ۔۔۔ آخر فاروق اچھل پڑا۔

"وہ مارا ۔۔۔ ابا جان میں سمجھ گیا۔"

"ٹھہرو فاروق، ابھی نہ بتانا۔" فرزانہ چلائی ۔۔۔ اس پر جوش کی حالت طاری تھی، آخر اس نے کہا۔

"اوہ، میں بھی سمجھ گئی۔"

"اور میں بھی۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

"بہت خوب ۔۔۔ ذرا میں تو سنوں، تم کیا سمجھ گئے۔"

اور وہ بتانے لگے کہ ان کے والد نے مجرم کو کس طرح اور کس وقت پہچانا۔ ان کی بات سن کر انسپکٹر جمشید کھل اٹھے اور بولے:

"واقعی، تم بہت ذہین ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم یہ بات معلوم نہیں کر سکو گے۔ میں تمہیں داد دیتا ہوں۔"

"جی، کیا فرمایا آپ نے ۔۔۔ کیا دیتے ہیں ۔۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"داد ۔۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"یہ کیا چیز ہوتی ہے ۔۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"ارے، تم داد کا مطلب نہیں جانتے۔"

"ابا جان، آپ اس داد کی تو بات نہیں کر رہے جو شاعروں کو ملتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"

"اوہ ۔۔ تو ابا جان آپ ہمیں صرف داد دے کر ٹرخا رہے ہیں۔ بھلا ہم کیا کریں گے داد کو لے کر ۔۔"

"جی ہاں، بالکل ۔۔۔ ہمیں نہیں چاہیے داد۔" محمود بولا۔

"اور کیا ۔۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید کو ان کے جملوں پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ان کے منہ سے تو ایک بات یونہی نکل گئی تھی، لیکن تینوں نے اسے پکڑ ہی لیا تھا ۔۔۔ آخر انہوں نے کہا:

"شاعر حضرات تو داد کے لیے مرے جاتے ہیں اور تم داد کے نام پر برا

سامنہ بنا رہے ہو — خیر بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟"

"آپ نے اس کیس کے دوران ہمیں دو مرتبہ انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔"

"اوہ ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا — گھر پہنچتے ہی تمہارا حساب کتاب صاف کر دیا جائے گا۔" انھوں نے کہا۔

"ابا جان —" فاروق نے مکا ہوا میں لہرا کر کہا۔

"زندہ باد۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔

—❖—

ڈی آئی جی صاحب ایک شام گھر پہنچے، انھوں نے کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو کوٹ کی ایک جیب میں گول گول سی چیزیں محسوس ہوئیں — وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے ایسی کوئی چیز جیب میں نہیں ڈالی تھی — تیزی سے انھوں نے اپنا ہاتھ باہر نکالا — ان کے ہاتھ میں کانچ کی پانچ گولیاں تھیں، وہی گولیاں جن سے گندے بچے گلیوں میں کھیلا کرتے ہیں۔

وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

ناول آپ نے پڑھا —

اب اشتیاق احمد آپ کا امتحان لیتے ہیں۔ ان کا اس ناول کے بارے میں آپ سے ایک سوال ہے:

انعامی سوال ۱۰

سوال: مجرم کی شخصیت کے بارے میں انسپکٹر جمشید کو یقین کس طرح ہوا؟

اس سوال کا جواب ہمیں بھیج دیجیے۔ ہم اشتیاق احمد سے آپ کے جواب کی تصدیق کروا کر ان ہی کے دستخطوں سے آپ کو صحیح جواب بھجوا دیں گے۔ اس طرح آپ کی ذہنی آزمائش میں اشتیاق احمد بھی شریک ہوں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ آپ نے ناول کس قدر غور سے پڑھا اور کس حد تک دلچسپی لی — ناول غور سے پڑھیے اور اشتیاق احمد کے سوال کا جواب دینا نہ بھولیے — ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب ہی آپ کا انعام ہوگا۔

(ادارہ)

انسپکٹر جمشید سیریز نمبر ۱۱

گولیوں کی وبا

- وہ گولیاں کیسی تھیں ؟
- شہر میں ان گولیوں کا ایک طوفان سا آجاتا ہے ۔
- پھر ہر وہ گھر پریشانی کا شکار ہو گیا جس گھر میں گولیاں پہنچیں ۔
- شہر کے افسران کی پریشانی انتہا کو پہنچ جاتی ہے ۔
- اچانک شہر میں ایک اعلان کیا جاتا ہے — اعلان کیا تھا ؟
- یہ اعلان کس نے کیا تھا ؟
- انسپکٹر جمشید گھر پہنچے تو ان کی جیب میں سے بھی گولیاں نکلیں ۔ اسی روز خان رحمان اور پروفیسر داؤد بھی شکار ہو گئے ۔
- محمود، فاروق اور فرزانہ گولیوں کی تلاش میں گھر سے نکلتے ہیں ۔
- ایک بالکل نئی اور حیرت انگیز کہانی، جس میں مجرم سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا ۔
- انسپکٹر جمشید نے شہر والوں کو گولیوں کی وبا سے کیسے نجات دلائی ۔

"گولیوں کی وبا"

آپ ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر نہیں رہیں گے —